

سلسلہ تذوۃ المصنفین دہلی

(۱۱)

# وحی الہی

تالیف

مولانا سعید احمد امروہوی

قیمت غیر مجلد

3/1-

سلسلہ تذوۃ المصنفین دہلی  
نذرۃ المصنفین

قیمت مجلد

4/0-



# وحی الہی

مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب، جس میں وحی اور اس سے متعلقہ مسائل کے تمام گوشوں پر وقت کے جدید اسلوب میں دلپذیر بحث کی گئی ہے۔

تالیف

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے

مدیر برہان

ندوۃ المصنفین اردو بازار

135306

مارچ	طبع دوم	جمادی الاخریٰ
۱۹۵۲ء		۱۳۷۱ھ
چار روپے	مجلد	قیمت
تین روپے	غیر مجلد	"

مطبوعہ اشوکا پریس دہلی

## فہرست مضامین وحی الہی

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۷۲	مشرکین کے اعتراضات کی تردید	۳۶	ایک سوال اور اس کا جواب	۵	دیباچہ
۷۶	حضرت جبریل کی توثیق	۳۸	مزید تشریح	۷	وحی کی ضرورت
۷۷	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توثیق	۴۰	یہ آواز کس کی تھی	۸	عقل کی کوتاہی
۷۸	قرآن کا اقرار کیا ہی نہیں جاسکتا	۴۲	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآنی تصریحات	۱۰	فلاسفہ کا اعتراف عجز و نارسائی
"	معلق قرآنی تصریحات	۴۳	انسانی شکل میں آنا	۱۲	عقل اور دل
۸۲	قرآن آپ کے طلب پر نازل ہوا	۴۶	فرشتہ کا اپنی اصلی شکل میں آنا	۱۵	موجبات تکین و یقین
"	روح محفوظ کا بیان	۵۴	علامہ سید محمد نور شاہ کشمیری کی تقریر	۲۳	وحی کے لغوی اصطلاحی معنی
۸۴	قرآن کو کلام اللہ بھی کہا گیا ہے	"	چھٹا طریقہ وحی	۲۶	وحی اور الہام کا فرق
"	قول بشر کہنے پر عذاب معزز کی وعید	"	ساتواں طریقہ وحی	"	وحی کی حقیقت
۸۵	قرآن مع عربی الفاظ کے	۶۱	آنحضرت اور مسئلہ رویت باری کی تحقیق	۲۷	امام غزالی اور دوسرے متکلمین کی آراء
۸۶	وحی الہی ہے	۶۱	قرآن اور وحی	۲۸	ابن سینا کی رائے
۸۷	تنقیحات و نتائج	۶۱	قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر تمدی	۳۰	حافظ ابن تیمیہ کی رائے
۹۰	خدا کی صفا ذاتیہ پر ایک عام بحث	۶۴	بعض جزئی واقعات سے استدلال	۳۱	وحی کی مختلف صورتیں
۹۳	صفات کی حقیقت	۶۸	اسدلال	"	رویائے صادقہ
۹۵	صفت ذاتیہ اور صفت فعلی	۶۸	عدم اختلاف سے قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر استدلال	۳۲	رویائے صادقہ سے آغاز وحی کی حکمت
۹۶	تعدد صفات اور وحدانیت ذات	"	اہل کتاب قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے باخبر ہیں	۳۳	نفت فی الروع
۹۸	صفات کا ظہور و حوادث میں	"		۳۴	صلصلة الجرس
				۳۵	اس حالت کی شہرت

۱۴۶	واقعاتِ آئندہ کی پیشینگوئی	۱۲۳	مراتب کمال و نقص کا تفاوت	۱۰۰	صفات لاعین و لا غیر میں
"	غلبہ روم کی پیشینگوئی	"	استکمال و تکمیل	۱۰۱	حوادث کا قیام ذاتِ باری سے
"	جنگ روم و ایران کا واقعہ	۱۲۲	فکر و حدس	۱۰۳	ایک تنبیہ
۱۴۷	ایرانیوں کی فتح	۱۲۵	عقل کے مراتب متفاوتہ	۱۰۷	کلام الہی
۱۴۸	مشرکین مکہ کی مسرت	۱۲۸	ملکہ نبوت و سبب کی سبب نہیں	"	قرآن مع الفاظ کے کلام الہی ہے
"	کفار مکہ کا استبعاد اور	۱۲۹	ایک اور نظریہ	۱۱۱	کیا کلام کے لئے نطق ضروری ہے
"	اس کی وجہ	۱۳۵	نبی کی بشریت	۱۱۳	زبانِ حال کی وسعت گویائی
۱۶۰	پیشینگوئی کی صداقت کا ظہور	۱۳۸	وحی اور محققین یورپ	"	قرآن مجید میں خدا کی صفت
۱۶۱	چند اور پیشینگوئیاں	۱۳۹	مجاہد تحقیق	۱۱۴	کلام کا ذکر
۱۶۲	فصاحت و بلاغت	"	تسلل وحی اور	۱۱۵	کلام صفت کمال ہے
"	فصاحت و بلاغت ذوقی و	۱۴۸	نزولِ حبرِ علی	"	خدا کلام کرتا ہے
۱۶۵	و حبدانی چیز ہے	"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم	"	خدا اپنی شان کے مطابق
"	بلخار و شعراء عرب پر قرآنی	۱۴۸	کا حزن و دلال	۱۱۶	کلام کرتا ہے
۱۶۷	بلاغت کا اثر	"	فرت کے بعد نزولِ وحی اور	۱۱۷	خدا ندا کرتا ہے
۱۸۴	عدم اختلاف	۱۵۰	اس کا تسلسل	۱۱۸	قرآن اور نطقِ ربانی
۱۸۵	احکام و شرائع	۱۵۲	وحی غیر متلو	"	انسانوں سے کلام الہی کی
"	قرآن کا محکم دستور العمل	"	قرآن مجید وحی الہی	۱۱۹	صورتیں
۱۸۸	قرآن کی روح سے تشبیہ	۱۵۷	کیوں ہے	"	دماکان بشران یکیشہ الا وحیاً
"	حضرت علیؑ کا ارشاد	"	وصفِ اعجاز	"	کی تفسیر
"	قرآن مجید کا اسلوب	"	وجہ اعجاز	"	آیت کی تفسیر میں علامہ سید
۱۸۹	بیان اور بعض عیسائی	۱۶۰	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم	۱۲۰	محمد انور شاہ کی تقریر
"	مصنفین	۱۶۰	کی اہمیت	۱۲۲	ملکہ نبوت اور وحی
۱۹۱	اشعار و موضوع کی تنقید	۱۶۳	واقعاتِ غیب	"	حکمت

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دنیا میں سینکڑوں سوالات ہیں جن کے جواب میں انسان سب کچھ کہنے کے بعد  
 آخراً ایک ایسے مرحلے پر پہنچتا ہے کہ پھر اس کے لئے جواب کی کوئی گنجائش نہیں رہتی  
 ہاتھی اس قدر بڑا ہے اور تو انا کیوں ہے؟ چیونٹی کیوں اتنی نحیف و زار ہے؟ آم کے درخت پر آم  
 ہی کیوں لگتے ہیں جامیں کیوں نہیں پیدا ہوتیں؟ غم سے رونا اور خوشی سے ہنسا ہی کیوں آتا  
 ہے اس کا برعکس کیوں نہیں ہوتا؟ یہ اور اس طرح کے سینکڑوں سوالات ہیں جن کے جواب کا  
 آخری مرتبہ یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کو اشیاء کے طبعی خواص اور ان کے نوعی مختصات پر محول کر دیا جائے  
 پھر اگر اس کے بعد بھی یہ سوال کیا جائے کہ اس شے کی یہ طبعی خاصیت کیوں ہے اور یہی کیوں  
 ہے کوئی اور چیز کیوں نہیں؟ تو اس کے جواب میں ایک ملحد کہے گا کہ مادہ کی ترکیب اسی طرح  
 ہوئی ہے لیکن موجد جواب دیگا کہ خدا نے ہر شے کی صورتِ نوعیہ میں ایک الگ خاصیت رکھی  
 ہے جو اب دونوں کے مختلف ہوں گے لیکن ہر ایک کا یہ جواب ایک آخری جواب ہوگا کہ اگر اس  
 کے بعد بھی سائل "کیوں" سے سوال کرے تو اس کے جواب میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

وحی کا مسئلہ اسی طرح کے مسائل میں سے ہے جس کی حقیقت کے سمجھانے میں ہم بنا  
 سکتے ہیں کہ خدا کلام کرتا ہے۔ خاص خاص انسان (انبیاء) اس کا کلام سنتے اور سمجھتے ہیں اور ہم  
 یہی کر سکتے ہیں کہ ان دو دعویوں پر جو عقلی اعتراضات کئے جائیں ان کو رفع کر دیں، لیکن

اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص "ایسا ہی کیوں ہوتا ہے" کہہ کر ہم سے سوال کرے گا تو اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ اچھا پہلے تم ہمارے ہزاروں "کیوں" کا جواب دیدو پھر ہم بھی تمہیں سمجھا دیں گے کہ خدا انبیاء میں ہی کیوں کلام ربانی کو سمجھنے کی استعداد رکھتا ہے ہمہ شامیں کیوں یہ صلاحیت نہیں ہوتی۔

زیر نظر کتاب میں وحی الہی پر جو بحث کی گئی ہے اس کا مقصد انہیں سوالات کا جواب دینا ہے جو واقعی ایک طالب تحقیق کے دل میں اس مسئلہ پر غور کرنے کی راہ میں پیدا ہو سکتے ہیں ان کے علاوہ وہ لوگ جو ازراہ بغض و عناد اپنے "کیوں" کا سلسلہ کہیں ختم ہی نہیں کرتے وہ اس کے مخاطب نہیں ہیں۔

ان اوراق میں کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بیان کردہ حقیقت وحی کو عقلی اور نقلی حیثیت سے عام فہم انداز بیان کے ساتھ پیش کر دیا جائے یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہو سکی ہے؟ اس کا فیصلہ ارباب نظر و خبر کریں گے۔ واللہ ہو

المستعان وعلیہ التکلان

سعید احمد اکبر آبادی

ندوة المصنفین دہلی

۳۱ اگست ۱۹۴۱ء



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله وكفى سلام على عباده الذين اصطفى

## وحی کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔ زیورِ علم و عقل سے آراستہ کیا اور اس نے انسان کے جسمانی نشوونما اور اس کی مادی زندگی کی ترقی و فلاح کے لئے کارگاہِ ہست و بود کو رنگ و رنگ کے نقش و نگار سے سجایا اور ابنِ آدم کی تربیت و کامرانی کے لئے ایک مخصوص نظام کے ماتحت قطعی و جتنی وسائل معیشت پیدا کئے چنانچہ وہ پانی پیتا ہے، ہوا میں سانس لیتا ہے۔ بادلوں سے بارش ہوتی ہے جو اس کے کھیتوں اور باغوں کو سرسبز و شاداب کر دیتی ہے اور جس سے اناج اور چھلن پیدا ہوتے ہیں۔ آگ سے وہ اپنی غذا تیار کرتا ہے۔ آفتاب کی دھوپ سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں جن کی تخلیق میں انسان کی صنعت و حرفت کو کوئی دخل نہیں ان پر ہی حیاتِ انسانی کے قیام و بقا کا دار و مدار ہے۔ یہ تمام اشیاء وہ ہیں جن کو مادی زندگی کے قدرتی وسائل و ذرائع کہا جاتا ہے، لیکن اس مادی زندگی سے بڑھ کر انسان کی ایک اور زندگی ہے جو روحانی اور اخلاقی زندگی کہتے ہیں اور اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ یہ ہی وہ اصل حیات ہے جس پر انسان کی اجتماعی زندگی کا صالح اور درست نظام قائم رہ سکتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسان کی تمام تمدنی ترقیات، عمرانی ایجادات و اختراعات اور عقلی تحقیقات و اکتشافات

انسانیت کی تعمیر میں مفید ثابت ہونے کے بجائے خود اس کے لئے سہم قاتل بن جائیں اور اس کی سوسائٹیاں وحشیوں اور درندوں کے مہیب ریوڑ کی شکل میں تبدیل ہو کر رہ جائیں جس طرح پورے نظام شمسی کے قیام و بقا کا دار و مدار اجرام فلکی کے باہمی جذب و انجذاب پر چڑھ چڑھیک اسی طرح انسانی سوسائٹی کے نظم و نسق اور اسکی فلاح و نجات کا انحصار حاسہ اخلاقی یا روحانی اعمال و ضوابط پر ہے۔

اس بنا پر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ رب العالمین جس نے انسان کی مادی و جسمانی زندگی کے قیام و بقا کا خود دخل کیا اس کے لئے ایسے قدرتی وسائل و ذرائع پیدا کئے جن کی صنعت و تخلیق میں انسان کے اپنے دست ایجاد کو مطلقاً دخل نہیں ہے۔ وہ ہیں اخلاقی اور روحانی زندگی کے ایسے قدرتی اصول و آئینے بتاتا جو صالح تمدن کے اساس و بنیاد بنیں اور جو قطعی و جمعی ہونے کی وجہ سے ہر ملک اور ہر زمانہ میں ہر شخص کیلئے لائق عمل اور درخور قبول و پذیرائی ہوں اور ان میں کسی کے لئے اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔

عقل کی کوتاہی | کہا جاسکتا ہے اس طرح کے اصول و ضوابط کے لئے یہ کیا ضروری ہے کہ وہ خدا کے بنائے ہوئے ہوں اور اس نے ہی انسان کو ان کی تلقین کی ہو جس طرح انسان اپنے رہنے کے لئے مکانات بناتا ہے۔ گرمی سردی سے محفوظ رہنے کی غرض سے اپنے لئے کپڑے بنتا اور تیار کرتا ہے اور اسی طرح کی ہزاروں صنعتیں اس نے اپنے نفع کے لئے ایجاد کر رکھی ہیں، وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ اپنے لئے اخلاقی ضوابط و قواعد بنائے اور اپنی روحانی تشنگی کو فرود کرنے کے لئے خود ہی کوئی نسخہ کیمیا تجویز کرے، عقل جس طرح مادی ترقی کی راہ میں رہنمائی کرتی ہے، اخلاق اور روحانیت کے میدان میں بھی وہ اسی طرح شمع ہدایت

لے ڈاکٹر آج کل مرحوم نے یورپ کی عقلی ترقیات کا اسی بنا پر نہایت بیخیر پیڑیہ میں نام کیا ہے کہ وہاں ان سب ترقیوں کے باوجود اخلاق و روحانیت کا فقدان ہے اور اس لئے انسانی زندگی کا شیرازہ اطمینان و سکون حد درجہ پر آگندہ و پریشان ہو فرماتے ہیں

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا      زندگی کی شب تار یک سحر کر نہ سکا

ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گذر گاہوں کا      اپنے افکار کی دنیا میں سحر کر نہ سکا

بن سکتی اور اس کا ناخن تدبیر دونوں جگہ شکل اور پچھیدہ مسائل کی گرہ کشائی میں کارگر ثابت  
 ہو سکتا ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ کسی انسان کی عقل کتنی ہی کامل و مکمل ہو نقص سے مبرا نہیں  
 ہو سکتی۔ انسان خود اپنی فطرت و طبیعت کے اعتبار سے ناقص و غیر مکمل ہے۔ اس بنا پر اس کی کوئی قوت  
 بھی خواہ ظاہری ہو یا باطنی، مادی ہو یا روحانی، من کل الوجوه کامل نہیں ہے۔ ہر معاملہ میں صحت کے ساتھ  
 خطا، کمالات کے ساتھ نقص اور تذکرے کے ساتھ سہو و نسیان کا خدشہ لگا ہوا ہے اور کیوں نہ ہو امکان و حد  
 کی ظلمت کے ساتھ کمالات بے خطا کا نذر جمع کس طرح ہو سکتا ہے جس طرح انسان رنگ اور شکل میں ایک  
 دوسرے سے متباہن ہیں ٹھیک اسی طرح اپنے قوائے فکریہ و باطنیہ کے لحاظ سے بھی وہ مختلف اور یک  
 دوسرے سے جدا ہیں یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی خوش نصیب عقل حقیقت کے بحرِ ناپیدا کنار میں غوطہ زنی  
 کر کے صداقت و حقانیت کے چند آبدار موتی حاصل کر لے لیکن اس کے پاس وہ وقت کہا ہی جس سے وہ تمام  
 دنیا کو اس صداقت کا معترف بنا سکے۔ کوئی انسانی اختراع و ایجاد خواہ کتنی ہی حقیقت سے قریب ہو اختلاف  
 کی گنجائش سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ غوم کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ آج تک دنیا کی ممتاز عقلیں بھی  
 کسی ایک مسئلہ پر متفق رائے نہ ہو سکیں۔ فلسفہ یونان کے جو بنیادی نظریے تھے اور جو قریباً قرن تک  
 عالم میں مقبول و رائج رہے آخر آج موجودہ فلسفہ یورپ نے ان کو پرزہ پرزہ کر کے فضا میں منتشر کر ڈالا  
 ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ آج فلسفہ حائل کی عمارت جس بنیاد پر کھڑی ہے مستقبل میں کوئی قوم اپنے جدید  
 نظریات و افکار کی قوت سے اسے پائیدار نہیں کر دے گی اور اس عمارت کے کھنڈروں پر ایک نئے نظام  
 فکر و عمل کی دنیا نہیں بسائیگی۔ قرون اور صدیوں کے بعد جو کچھ ہو گا اسے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن اتنا تو  
 اب بھی دیکھا جا رہا ہے کہ فلسفہ جدیدہ کی شان دار عمارت کو ارتیاب و شک کا گھن ابھی سے لگنا شروع  
 ہو گیا ہے۔ مولانا عبدالباری ندوی اتنا ذہین و فلسفہ جدیدہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن "فہم انسانی" کے مقدمہ  
 میں اس رازِ سرستہ کا افشاں اس طرح کرتے ہیں۔

اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد جدید فلسفہ کی تاریخ زیادہ تر نام بدل کر کھلے یا چھپے اقرار  
 جہل کی تاریخ بن کر رہ گئی، لاک کے یہاں یہ اقرار حسیّت کے نقاب میں ہے اور برکے  
 کے ہاں ادعاے نقوریت کے مگر اتنی باریک اور شفاف کہ روپوشی زیادہ رونمائی کی زینت  
 ہے آخر برکے کے بعد ہی ڈیوڈ ہیوم نے اس رونما نقاب کو بھی تار تار کر دیا اور نہ صرف جہل  
 ارتیابیت کا کھل کر اقرار کیا بلکہ اپنے کو ارتیابی ہی کہلانا پسند کیا۔

فلاسفہ کا اعتراف عجز و نارسائی | عقل انسانی کی کوتاہی اور اس کے عجز و تصور کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو  
 گا کہ وہ عظیم المرتبت فلاسفہ عالم جن کے فلسفیانہ افکار و نظریات عقل و فکر کی تاریخ ارتقاء کا آخری نقطہ و عروج  
 مانے جاتے رہے ہیں جب عالم حقیقت کی لامحدود وسعتوں میں انہیں قدم قدم پر حیرت و گمشدگی سے ساقط  
 پڑا تو خود انہیں بھی بجز اس کے کوئی اور چارہ کار نہ تھا کہ وہ برعقل کی کوتاہ بینی اور فکر کی نارسائی کا اعتراف  
 کریں سقراط کا یہ متولہ حدیث تو اتر تک مشہور ہے ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے، انگلستان کا مشہور  
 فلسفی ڈیوڈ ہیوم صاف لفظوں میں اقرار کرتا ہے کہ

”انسان عقل مخلوق ہے اور اس لحاظ سے علم اس کی خاص دماغی غذا ہے لیکن ساتھ

ہی انسانی ذی عقل و فہم کے حدود اتنے تنگ ہیں کہ اس باب میں اس کو وسعت و ادعا

دونوں حیثیات سے بہت ہی کم اپنے فتوحات سے تشفی نصیب ہو سکتی ہے۔“

”فہم انسانی“ میں ہی ایک اور جگہ فلسفہ کا اس طرح مذاق اڑاتا ہے۔

”مکمل سے مکمل فلسفہ طبعی بھی صرف یہ کرتا ہے کہ ہمارے جہل کو ذرا اور دور کر دیتا ہے

جس طرح مکمل سے مکمل فلسفہ مابعد الطبیعیات اور اخلاقیات کا صرف یہ کام ہوتا ہے کہ ہمارے

اس جہل کے وسیع حصوں کی پردہ دری کر دیتا ہے، مطلب یہ ہے کہ فلسفہ اسرار کائنات کی

نہیں صرف ہمارے جہل کی پردہ دری کرتا ہے اس کا حاصل اگر کچھ تھا یا ہو سکتا ہے تو انسان

کی کمزوری اور کوششی کا نشانہ دیکھنا دکھانا جس سے بھاگنے کی کوشش کے باوجود بار بار

دوچار ہونا پڑتا ہے۔“

طیس

ہیموم تو خیر ارتیبانی تھا۔ ہر چیز کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا، مادہ پرستوں کا ابوالابار و مقبرا

دوئلہ سمجھتا تھا کہ مہم کا قول ہے کہ کوئی بات سچ نہیں اور اگر ہے تو ہم کو معلوم نہیں ہے۔

پس جب عقل خود ناقص ہے تو کسی صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لئے جو ذرائع اختیار کئے جائیں گے

یعنی قیاس استقراء و تلمیذ ان کی نسبت کیونکہ بونوک کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسی صحیح اور یقینی نتیجہ تک پہنچا کر رہتا ہے

یہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کے یقینی علم کے لئے مشاہدہ سب سے بڑھ کر کوئی اور قوی دلیل نہیں ہو سکتی لیکن آپ نے

یہ سن کر حیرت ہوگی کہ قدیم فلاسفہ میں تو لا اور یہ کا ایک مستقل گروہ تھا ہی جو کہا کرتا تھا کہ ہمیں کسی شے کی کوئی

حقیقت معلوم نہیں۔ یورپ کے جدید فلاسفہ کی صف میں بھی برکلے جیسے فلسفی نظر آتے ہیں جو کہتے ہیں کہ

کسی شے کا وجود صرف وہی ہے جو ذہن میں ہے اس کے علاوہ وجود خارجی کے کوئی معنی نہیں۔ اس سے

ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان فلاسفہ نے جو کچھ کہا وہ ٹھیک ہے۔ بلکہ مدعا صرف یہ دکھانا ہے کہ اگر عقل کو آواز

چھوڑ دیا جائے اور خدا کی ہدایت اس کی دستگیری نہ کرے تو خود اس کی کوششیں بسا اوقات فرط حیرت

کی ناکامی و مایوسی پر منتہی ہوتی ہیں اور ادراک حقیقت کی کسی روشنی تک پہنچنے کے بجائے وہ لاعلمی و

نادانی کی تاریکیوں میں خود اپنے آپ کو بھی گم کر دیتی ہے۔

اس موقع پر اتنی بات اور یاد رکھتی چاہئے کہ جب طبیعیات میں عقل کی کوتاہی کا یہ عالم ہے

کہ وہ قطعی طور پر کسی چیز کی ذاتیات اور عرصیات میں بھی امتیاز نہیں کر سکتی اور اسی بنا پر اباب منطوق

لے یہاں یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ اس باب میں جن فلاسفہ کے اقوال نقل کئے گئے ہیں وہ سب ہم انسانی سوما خود ہیں

جو پروفیسر عبدالباری ندوی کے قلم سے ڈیوڈ ہیموم کی کتاب ہیمون انڈر سٹینڈنگ کا نہایت عمدہ ترجمہ ہے اس کے علاوہ

موصوف کی دو اور کتابیں ”برکلے اور مبادی علم انسانی“ جو برکلے کی کتاب کا ترجمہ ہے یہ دونوں بھی پیش نظر رہی ہیں

تسلیم کرتے ہیں کہ کسی چیز کی بھی حد نام بیان کرنی ناممکن ہے، تو ظاہر ہے مابعد الطبیعیات میں اس کی لنگ پائی کا کیا حال ہوگا اور چونکہ فضائل اخلاق اور روحانی کمالات کا تعلق ایک بڑی حد تک حقائق مابعد الطبیعیات کے تصور سے ہے اس لئے عقل اس راہ میں ہماری کامیاب رہنما ثابت نہیں ہو سکتی اور نہ ہم اس پر اعتماد رکھ سکتے ہیں۔

عقل اور دل | اس مقام پر مزید توضیح و تشریح کی غرض سے اتنا اور یاد رکھئے کہ انسان کو جتنے معاملات پیش آتے ہیں ان کا تعلق صرف عقل سے ہوتا ہے یا فقط دل سے اور یادوں سے اور یہ واقعہ ہی کہ انسانی زندگی کا قیام و بقا اور اس کی روحانی و اخلاقی دنیا کا نظم و نسق مبنی ہے اس بات پر کہ انسان عقل اور دل دونوں سے کام لے کیونکہ جس طرح عقل مصدر شعور و احساس ہے۔ اسی طرح دل جذبات و عواطف کا سرچشمہ ہے اگر ہم عقل (Reason) کے ہی تابع فرمان ہو جائیں اور دل (Feeling) کو ہم پر کوئی دسترس حاصل نہ ہو تو ہم اس فلسفی کی طرح ہو کر رہ جائیں گے جس کو شادی میں غم اور غم میں شادی کی تصویر نظر آتی ہے اور جو اپنی ہستی کے قطرہ کو وجودِ ابدی کے بحرِ ناپیدا کنار میں فنا کر دینے کے بعد ہر قسم کے فعل و عمل سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم عقل سے بالکل صرف نظر کر لیں اور اپنے تمام معاملات اور افعال اعمال دل کے میلانات و عواطف کے تابع بنالیں تو اس کا انجام بھی بھرتا ہی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا اس وقت ہماری مثال انتہائی عیش پرست اور ظالم و جابر انسان کی سی ہوگی۔ یا پرلے درجہ کے مغلوب العجزات نرم خوار و ہراساں شخص کی سی۔ غرض یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں خیالات و احساسات کا توازن مفقود ہو کر انسانی اجتماعیات کے شیرازہ کو درہم بہم کر کے رکھ دینگا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ دونوں میں ارتباط و التیام ملحوظ رکھا جائے لیکن محبت کے عام نفسیاتی قانون کے مطابق دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے کی طرف نسبتاً زیادہ مائل ہونا چاہئے۔ اس مرحلہ پر ہمارا دعویٰ ہے کہ عقل کو ایک بڑی حد تک "ادب خوردہ" دل ہونے کی ضرورت ہے جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے عقل محض کی رہنمائی ہمارے لئے کثرتِ کار کا قابلِ اطمینان ذریعہ نہیں۔ البتہ وہ

عقل جو علامہ اقبال مرحوم کے بقول "ادب خوردگی دل" کے زیور سے آراستہ ہے وہ ہماری روحانی تشنگی کو فرو کرنے کا بہت کچھ سامان رکھتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

نقشے کہ بستہ ہمہ اوہام باطل است عقلے ہم رساں کہ ادب خوردہ دل

ذیل کے شعر میں بھی انہوں نے اسی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔

یامردہ ہے یانزع کی حالتیں گرفتار جو فلسفہ لکھانہ گیا خونِ جگر سے

فلسفہ اشراق | جن لوگوں نے تاریخ فلسفہ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جب مسیحیت اور فلسفہ معض

دولوں انسان کی روحانی تشنگی کے فرو کرنے میں ناکام ثابت ہوئے جس کی وجہ یہ تھی کہ مسیحیت عقل کو

مطمئن کرنے میں ناکامیاب رہی اور فلسفہ روح اور دل کے لئے کوئی سامانِ تسکین فراہم نہیں کر سکا

تو افلاطون کے متبعین نے فلسفہ اور مذہبِ دونوں کی آمیزش سے ایک سچون مرکب تیار کی جس کا نام

فلسفہ اشراق (Neo-Platonism) رکھا گیا۔ اس کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ طبیعیاتی مسائل و مباحث

کے ساتھ ساتھ اخلاقیات اور الہیات اور روحانیت کے مسائل بھی اس میں شامل تھے فلسفہ کے اس لئے

اسکول کا بانی فلاطینس (Plotinus) تھا جو ۲۶۲ء میں مصر میں پیدا ہوا اور ۳۰۴ء میں روم میں انتقال کر گیا۔

اسباب و علل خواہ کچھ بھی ہوں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس فلسفہ کو مشرق میں اور مغرب میں دونوں

جگہ بہت فروغ ہوا اور غالباً یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ایشیا کے دل و دماغ پر تو اس فلسفہ کا اتنا زبردست استیلا

ہوا کہ مذہبی عقائد کی مضبوط بنیادیں تک تزلزل ہو گئیں۔ لیکن چونکہ اس فلسفہ کا تمام تار و پود عقل کی مشکافیوں

سے ہی تیار ہوا تھا اور اگرچہ اس میں ضمیر (کانشنس) کی پکار کو بھی دخل تھا، لیکن وہ مغلوب تھی اور غلبہ عقل

کو ہی تھا اس لئے معرفتِ الہی حاصل کرنے کے میدان میں انہیں قدم قدم پر ٹھوکر پی کھانی پڑیں اور یہ رہ لازم

حکمت و دانائی جانفروشانہ تک دو کے بعد بھی اس سرخشمہ ہدایت تک نہ پہنچ سکے جو روح اور دل کے

لئے واحد سرمایہ تشکیل ہے۔

فلسفہ اشراق خدا کو مانتا ہی نہیں، بلکہ وہ اس کو تمام کائنات میں جاری و ساری مانتا ہے اس کے نزدیک خدا منبع خیر ہے اور مادہ مخزن شر و ظلمات اس کے اذعان و یقین میں خدا حقیقت واحد ہے اور انسانی روح اس کا پر تو اس عقیدہ کے ساتھ ساتھ فلسفہ اشراق روحانیت، اخلاق، تزکیہ باطن اور تصفیہ نفس کی طرف بھی دعوت دیتا ہے اور انسان کو لذائذ جسمانی ترک کر کے تقویٰ و طہارت کی زندگی بسر کرنے پر ابھارتا ہے سب کچھ سہی لیکن اصل یہ ہے کہ چونکہ اس فلسفہ کی بنیاد کسی خدائی قانون (دوحی الہی) پر نہیں تھی اور یہ محض عقل کی لاپٹی کے سہارے کھڑا ہوا تھا۔ اس بنا پر خود خدا کی صفات و ذات کی نسبت اس فلسفہ نے ایسی موثر گافیاں لکیں کہ انہوں نے انسان کی روح کو دلاسا دینے کے بجائے اسے ایک اور ہولناک و رطوبت و تذبذب میں پھنسا دیا مثلاً اس فلسفہ نے بتایا کہ۔

(۱) خدا علت لعل ہے اور چونکہ علت تامہ سے معلول کا صدور بالاختیار و الارادہ نہیں ہوتا بلکہ بالاضطرار ہوتا ہے اس لئے عالم کی تخلیق بھی خدا سے اضطراراً ہوئی ہے، اس میں اس کی مشیت اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں، اس کی مثال بالکل آگ کی سی ہے کہ جب وہ پانی جا ہیگی تو حرارت پیدا ہوگی ہی، خواہ آگ کے لئے ارادہ ہو یا نہ ہو۔

(۲) خدا کی ذات اس قدر رفیع و عالی ہے کہ ہم اس کی طرف کسی صفت مثلاً علم، ارادہ اور خیر کا بھی انتساب نہیں کر سکتے، حد یہ ہے کہ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ وجود رکھتا ہے۔ کیونکہ ہر موجود کا تصور ممکن ہے اور خدا کا تصور ہو ہی نہیں سکتا (لَا یُحَدُّ وَلَا یُتَوَسَّرُ)

(۳) انسان کی روح اگر حسی لذتوں میں مبتلا رہے گی تو وہ قالب بدلتی رہے گی خواہ وہ کسی انسان کا ہو یا حیوان کا یا نباتات کا۔

غرض یہ ہے کہ اس فلسفہ نے کہیں درپردہ لا اوریت کی تلقین کی اور کہیں دیدانت فلسفہ کے



دیکھا دیکھی تنازع کا اقرار کیا۔ یہ لوگ چلے تھے حق کی تلاش میں، لیکن جب عقل محض کی قیادت راہ طلب کی جانگس صعوبتوں کی حریف نہ بن سکی تو انجام کار حضرت موسیٰ کی قوم کی طرح خود اپنے وجود کو بھی دادی حیرت میں گم کر کے بیٹھ رہے اور نہ کیا وجہ ہو کہ یہ فلسفہ روحانیت اور اخلاق کے چند در چند مواعظ حسنہ کے باوجود تمام دنیا کا تو کیا ذکر ہے کسی ایک انسانی سوسائٹی میں بھی عظیم الشان روحانی و اخلاقی انقلاب پیدا نہیں کر سکا، بلکہ حق تو یہ ہے کہ اس فلسفہ نے انسان کو دماغی بلند پروازیوں میں مشغول کر کے اسے عملی جدوجہد سے محروم کر دیا اور اس کی عملی قوتوں کو اس درجہ مضحل بنا دیا کہ وہ تقریباً از کار رفتہ ہو کر رہ گئیں۔ مرزا غاٹ نے شاید اسی قسم کے لوگوں کی نسبت کہا ہے -

ہاں اہل طلب کون سے طعنہ نایافت  
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

موجبات تسکین یقین | عقل منطقی اور فلسفہ ان سب دروازوں سے یا یوس لوٹنے کے بعد پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اچھا بتاؤ اطمینان و سکون کا وہ خزانہ کہاں ہے جو انسانیت کی روحانی طلب کو سکون عطا کر سکے قبل اس کے کہ آپ اس کا جواب معلوم کریں، یہ جان لینا ضروری ہے کہ یقین کی ماہیت کیا ہے؟ اور یہ کس طرح پیدا ہوتا ہے۔

کم و بیش تمام علماء نفسیات نے یقین کی ماہیت اور اس کے اسباب و علل پر بحث کی ہے لیکن نفس یقین کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں ہے بلکہ اسکی مختلف قسمیں ہیں مثلاً منطقی یقین *Logical Certainty* نفسیاتی یقین *Psychological Certainty* اور مذہبی یقین *Religious Certainty* اور یقین کا تحقق انہیں اقسام میں سے کسی ایک قسم کے ضمن میں ہوتا ہے، ان اقسام کی تعریفیں جدا جدا ہیں لیکن ان سب میں ماہی الاشتراک یہ ہے کہ یقین ایک طرح کا نفسی میلان ہے جو خاص خاص موثرات خارجی و ذہنی کے زیر اثر انسان کے قلب میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نفسی میلان کو پیدا کرنے کے لئے نہ فلسفیانہ اور منطقی

۱۵ تفصیلی معلومات کیلئے دیکھو 32033 v. ۱۰ pp. Encyclopaedia of Religion & Ethics

دلائل کی ضرورت ہے اور نہ ریاضی و اقلیدس کی بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ میلان نہ علم پر موقوف ہے اور نہ جہل پر اس کا انحصار نہ سچ پر ہے اور نہ جھوٹ پر فرض کیجئے ایک ڈاکٹر ہے جسے آپ جانتے ہیں کہ اس نے اب تک جتنے علاج بھی کئے ہیں ان میں وہ ناکام رہا ہے اس بنا پر اگر آپ کا کوئی عزیز بیمار ہو جائے تو چونکہ آپ کو اس ڈاکٹر کی نالائقی کا یقین ہے اس لئے اگر کوئی شخص آپ کو اس ڈاکٹر کے علاج کا مشورہ دیکر بھی تو آپ فوراً انکار کر دیں گے لیکن آپ کے برخلاف ایک اور شخص ہو جو کم از کم ڈاکٹر موصوف کے بیس کا میاب علاجوں کا مشاہدہ خود اپنی آنکھ سے کر چکا ہے اس لئے اگر آپ اپنے مریض عزیز کے علاج سے متعلق اس شخص سے مشورہ کریں گے تو وہ بے تامل و تردد کہے گا کہ اسی ڈاکٹر سے رجوع کیجئے کیونکہ اسے اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ کے باعث ڈاکٹر کی قابلیت و مہارت فن کا ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ آپ کو ڈاکٹر کی عارم قابلیت کا اس مثال سے واضح ہوا ہو گا کہ یہاں ڈاکٹر کی قابلیت کی نسبت شخص مذکور الصدر کا نفسی میلان (یقین) اس کے تجربہ پر مبنی ہے۔

اب اس کے بعد اس پر غور کیجئے کہ تجربہ کبھی مسلسل مشاہدہ سے پیدا ہوتا ہے اور کبھی عمل ذوق و وجدان سے۔ آپ نے اردو شاعری میں رند بادہ خواہ اور زاهد تقویٰ شعاری کی نوک جھونک دیکھی ہوگی دیکھئے زاهد شراب کی برائی کا یقین رکھتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس رند بادہ آشام کو شراب کی جان فروزی کا اس درجہ یقین ہے کہ وہ دعویٰ سے کہتا ہے :-

جاں فزا ہر بادہ جس کے ہاتھ میں جاگم گیا سب لکیریں ہاتھ کی گویا رنگِ جاں ہو گئیں

پھر نہ ہداس کے اس یقین کو توڑنے کے لئے دلائل و براہین پیش کرتا ہے تو وہ ان کے جواب میں صحت اتنا کہتا ہے ح

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخندانا پختی

غرض یہ ہے کہ یقین جس کی حقیقت ایک نفسی میلان کے سوا اور کچھ نہیں ہے مختلف جذبات قلبی کیفیت

کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس بنا پر کوئی ایک شخص کسی دوسرے کو اس لئے مطعون نہیں کر سکتا کہ وہ کسی چیز کی نسبت اس کی طرح یقین و اذعان کیوں نہیں رکھتا ہاں لعن طعن اور ملامت اگر ہو سکتی ہے تو وہ محض اس بات پر ہو سکتی ہے کہ اُس دوسرے شخص کے دل میں وہ کیفیت کیوں پیدا نہیں ہوتی جس کی وجہ سے دل میں اُس چیز کی نسبت نفسی میلان پیدا ہوتا، چنانچہ قرآن مجید نے ان کفار کے متعلق جو کلمہ حق قبول نہیں کرتے تھے۔ یہ نہیں کہا کہ انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کے وحی ہونے کا یقین کیوں نہیں آتا بلکہ

حَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ  
وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (بقرہ)

اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر ہر  
لگادی ہوا درانکی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

فرما کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان لوگوں میں فطرتاً اتنی صلاحیت و استعداد ہی نہیں کہ ان کے دل میں آنحضرت اور قرآن کی حقانیت و صداقت کے متعلق نفسی میلان پیدا ہو۔

اس تقریر سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یقین بذات خود کوئی مستقل چیز نہیں بلکہ وہ ثمرہ ہوتا ہے ایک خاص طرح کے طبعی قلبی جذبات و تاثرات کا، اب اس مقدمہ کو ذہن نشین کر کے آپ غور کریں گے تو بین طور پر محسوس ہو گا کہ وحی الہی انسان کے دل میں جس طرح طہینان دسکون پیدا کر دیتی ہے وہ بالکل ایک نفسیاتی طریقہ ہے اور اس لئے انسان اس پیغام ربانی کو سن کر اس شک و تردید سے دوچار نہیں ہوتا جس کا سبب بالعموم منطقی طرز بحث و استدلال ہوتا ہے۔

مثلاً اگر اس کو یہ بتانا ہو کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے تو وہ اس سے بحث نہیں کرتا کہ خدا کلام کرتا ہے یا نہیں؟ اور اگر کہتا ہے تو کس طرح؟ کیا اس کے لئے نطق پایا جاسکتا ہے؟ کیا نطق کے لئے عضلات و اعصاب کی ضرورت نہیں ہے؟ جبریل رسول اللہ کے قلب پر کلام خداوندی کا القا کرتے ہیں تو کس طرح؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ وہ جانتا تھا کہ یہ مابعد الطبیعیاتی حقائق ہیں جن کی گروہ کشانی آج تک کسی

کے ناخن تدبیر نے کی ہی اور نہ کر سکے، جب مشاہدات اور محسوسات کی دنیا میں ہی قدم قدم پر پھٹو کریں کھانی پڑتی ہیں تو عالم مجردات و معقولات کی وسعتیں کس طرح انسان کی محدود عقل میں سمٹ سمٹا کر جمع ہو سکتی ہیں اس لئے قرآن نے اس طریقہ بحث و استدلال کو چھوڑ کر ایک بالکل نفسیاتی اور بہت زیادہ موثر طریقہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور دعوت دی کہ آپ کے ایک عمل اور ایک حرکت و سکون کو نہایت گہری تنقید مگر انصاف اور عدل کی نگاہ سے دیکھو، اسے جانچو، پرکھو اور بتاؤ کہ کیا تم نے کبھی اُس ذات گرامی کو جھوٹ بولتے دیکھا ہے؟ کیا تمہیں کبھی ان کی کوئی حرکت مشتبہ نظر آئی ہے؟ کیا ان کے کسی قول و فعل پر بھی تمہیں کبھی حرف گیری کا موقع ملا ہے؟ اگر ان سب باتوں کا جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی میں ہے تو یقین کر دو کہ جس ذات نے عمر کا بہترین حصہ (۴۰ سال) اس تقویٰ و طہارت، معصومیت اور فضائل اخلاق کیساتھ بسر کئے ہیں وہ کج بھی جھوٹ نہیں بول سکتا اور آج بھی ان کی زبان حق ترجمان کسی ناملائم اور نادرست بات سے آشنا نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر چڑھ کر پہلی مرتبہ قریش کو دعوت اسلام دی تو یہی طریقہ اختیار کیا کہ ان سے پوچھا "بتاؤ! تم مجھ کو کیا سمجھتے ہو؟ جب سب نے بیک آواز اقرار کر لیا کہ "آپ تو امین صادق ہیں، آپ نے آج تک کوئی بات جھوٹ نہیں کہی" تو آپ نے ان تک اسلام کا پیغام جان التیام پہنچایا اور خود قرآن بھی سید کونین کی زبان اقدس سے یوں گویا ہوتا ہے۔

فَقَدْ كَلِمَتْ فَيَكْمُ عَمَلٍ مِنْ قَبْلِهِ

میں نے تو تمہارے درمیان مدت تک عمر گزاری

أَفَلَا تَعْقِلُونَ (یونس) ہے کیا تم بھیر بھی نہیں سمجھتے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وحی الہی پیغمبر کو ایک فاضل و کامل معلم یا ایک شفیق و

عقل مند باپ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور انسان کے کانشنس یا اسکے ضمیر و وجدان Inner feeling

سے اپیل کرتی ہے کہ جس طرح شاگرد و وجدانی طور سے استاد پر اور بیٹا باپ پر اعتماد رکھتا ہے اور اس لئے

اُستاد کی تعلیمات اور باب کی نصیحتوں کو شک و شبہ کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ اسی طرح تمام دنیا کو پیغمبر کی ذات پر اعتماد رکھنا چاہیے اور اس کی تعلیمات و ہدایات کو گوشِ حقیقت نبوت سے سُن کر حرزِ دل و جہاں بنا لینا چاہئے۔

پس یہ ثابت ہو گیا کہ اصل صداقت و حقانیت اور کامل اطمینان و سکون کا سرِ اغ صرف وحیِ الہی کے ذریعہ ہی مل سکتا ہے اور انسان کی روحانی تشنگی صرف اسی سرِ حتمیہ ہدایت کے آبِ زلال سے بجھ سکتی ہے۔ اللہ بس مابقی ہوس۔ ”مذہبی دیوانوں“ کا کیا ذکر ہے! خود ان لوگوں نے جو کہہ فلسفہ کی سب سے اونچی سطح پر نظر آتے ہیں اس حقیقت کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔

”ہم کو حصولِ صداقت سے مایوس ہو جانا چاہئے۔ بجز اس صورت کے کہ ہم یہ مان لیں کہ اس کا علم براہِ راست خود اسی ذات کی طرف سے عطا ہوتا ہے جو اس کا ابدی سرِ حتمیہ ہے، یعنی خود خدا کی طرف سے، اور یہی وہ آخری حل تھا جو نوافلاطینیوں نے اختیار کیا اور جسکو ارتیامیت نے ناگزیر کر دیا تھا۔ علمی تفکر کی راہ سے حصولِ یقین کی مایوسی ہی اس پر مجبور کر سکتی تھی کہ صداقت کو وحی کے اندر پانے کی کوشش کی جائے جو فکر سے بالاتر ہے۔“

ایک اور فلسفی کہتا ہے۔

”انسان کے پاس کوئی یقینی علم نہیں، ہاں خدا کے پاس ہے۔ اور مدعی جاہل انسان خدا سے اسی طرح سیکھتا ہے جس طرح بچہ بڑوں سے۔“

اس جملہ میں جس طرح ”بچہ بڑوں سے“ کی تشبیہ نہایت لمبیج ہے۔ قابل کی مراد یہ ہے کہ جس طرح بچہ بڑوں سے کوئی بات سیکھتا ہے اور بڑوں کی عظمت و جلالیت اور ان پر کامل اعتماد کی اذعان کی کیفیت کے قلب پر مستولی ہونے کی وجہ سے بچہ کے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خطرہ نہیں گذرتا کہ بڑوں کا سکھایا ہوا سبق

غلط ہوگا۔ ہی طرح انسان جب کسی بات کو اس اذعان کے ساتھ قبول کرتا ہو کہ یہ منجانب اللہ ہے تو اُسے اس وقت کسی تردد و تذبذب سے دوچار ہونا نہیں پڑتا اور وہ اپنے قلب میں طہینان و سکون کی ایک جاں فرور کیفیت محسوس کرتا ہے۔“

ڈیوڈ ہیوم کو سب جانتے ہیں کہ ارتیابی تھا اور وحی والہام کا بھی منکر تھا لیکن پھر بھی ایک موقع پر سا زفطرت کے نغمہ کی ایک ہلکی سی آواز اُس کے زبانِ قلم سے ظاہر ہو ہی گئی۔ وہ لکھتا ہے:-

”جہاں تک تجربہ اس طرح کے مسائل کی تائید کرتا ہے۔ وہاں تک تو یہ استدلال پر مبنی ہوتے ہیں لیکن ان کی اصل اور محکم بنیاد وحی و ایمان پر ہے۔“

مولانا عبد الباقی ندوی نے فہم انسانی کے دیباچہ میں اسی حقیقت کو نہایت دلچسپ اور بلینج پیرا میں ظاہر کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

”ظواہر عالم کی نسبت ہم بہت کچھ جانتے اور جان سکتے ہیں لیکن حقائق عالم کی نسبت کچھ جاننے کا دعویٰ کریں تو نرا جہل مرکب ہوگا اور بقول سقراط ہم تناہی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے۔ اس زندگی کو ہم چاہے جتنا سنواریں اور بنائیں لیکن اس کے آگے اور پیچھے کی اگر کچھ فکر ہو تو ”اول و آخر میں کہ نہ کتابا فتادست“ نہ پیچھے کا کچھ نشان ملانے آگے کی کچھ خبر دے سکتے ہیں سو اس کے کہ بس پنج کے اوراق الٹ پلٹ کر لال بھجکڑوں کی طرح ہرن کے پاؤں میں چلی کا پا باندھتے رہتے، غرض پلنے یا کائنات کے آغاز و انجام حقیقت و ماہیت، غرض و غایت کے بارہ میں، یہ یا اس طرح کے جتنے سوالات یا ان کی تفصیلات ہوں خالص عقل و استدلال نے ان کے بائے میں کبھی اذعان و طہینان نہیں بخشا، بلکہ فلسفہ سے لٹسائیت کی یہ پیاس اپنے حلق میں صرف کانٹوں کا اضافہ کرتی رہی اور جہاں انسانی عقل و فہم نے تجربہ کی راہ سے ذرا

بہک کر اس خازن میں اپنے دامن کو الجھایا تو خود فلسفہ کی ساری تاریخ گواہ ہو کہ طفلانہ ہمت نے  
دوہی چار قدم ڈلے تھے کہ شک اور ریب، جہل اور لاعلمی کے کانٹوں نے ہر طرف سے دامن  
پکڑنا شروع کیا، ایک نکلا نہیں اور دس نے پکڑا، جال کے اندر جتنا پھرتا، وہ اتنا ہی کھال  
کے اندر گھستا جاتا ہے۔

انسانیت کی بیشتر آبادی ہمیشہ اس وادی میں وحی و ایمان کی رہنمائی کو قبول کر کے چلتی رہی  
عقل کو اگر دخل دیا بھی تو زیادہ تر قبول ہی کے لئے۔ البتہ مغرب جہاں سے آفتاب نکلنا نہیں  
بلکہ جہاں ڈوبتا ہو وہاں کی نئی پرانی دنیا دونوں کو وحی و ایمان سے کچھ قدرہ بڑھ رہے تو  
اُس کے فلسفہ کی نئی پرانی دونوں تاریخوں کی جو کم و بیش ڈھائی ہزار سال کی وسعت میں  
پھیلی ہیں۔ ورق گردانی کر جاؤ، جتنا آگے بڑھتے جاؤ گے اتنا ہی دانش کی جگہ نادانی اور  
علم کی جگہ لاعلمی سے دوچار ہوتے جاؤ گے۔ (دیباچہ فہم انسانی)

اس حقیقت کو ایک اور مثال سے سمجھتے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے تمام مشاہدات کا تعلق بنیائی سے ہے  
لیکن کیا یہ صحیح ہے کہ مشاہدہ کا انحصار صرف قوت بصارت کے صحیح و سالم ہونے پر ہو؟ ہرگز نہیں! بصارت  
کے ساتھ ساتھ خارجی روشنی کی بھی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی کہ بنیائی کی۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی تیز نظر لیکن  
اگر کوئی خارجی روشنی نہ ہو، آفتاب کی ہو، یا کسی لمپ یا بجلی کی اور تمام فضعاتا تاریک ہو، تو ظاہر ہے کہ یہ  
تیز نظری کسی کام کی ثابت نہیں ہوگی پس اسی طرح عقل میں قدرت کی طرف سے جو قوت بصیرت و وحیت  
رکھی گئی، وہ اپنی جگہ مسلم اور درست، لیکن جس طرح بصارت بغیر خارجی روشنی کے محض بریکار ہے۔ اسی طرح  
عقل کی روشنی صرف اسی وقت کارآمد ہو سکتی ہے جبکہ خارج میں بھی اُس کی رہنمائی کے لئے کوئی قوی روشنی  
موجود ہو۔ اور یہ روشنی وہی ہے جس کو مذہب کی اصطلاح میں 'وحی' کہتے ہیں۔ آیت دلیں ہیں اسی  
کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَةٌ  
 وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيْمًا (الاحزاب)

وہ (خدا) وہی ہے جو خود اور اس کے فرشتے تم پر  
 رحمت بھیجتے ہیں تاکہ وہ تم کو تباہی کیوں نہ لگا کر نہ کرے  
 لے آئے اور اللہ مومنوں پر بڑا رحم کرنے والا ہے۔

بصارت اور بصیرت میں صرف ظاہر و باطن کا فرق ہے، ورنہ دونوں کا حال افادہ کے اعتبار سے بالکل  
 یکساں ہے۔ جس طرح آفتاب سماوی کے بغیر بصارت ناکارہ ہو ٹھیک اسی طرح عقل و خرد کی بصیرت بخیر  
 حقیقت کی جلوہ پاشیوں کے بغیر اپنی ذاتی صلاحیتوں کے باوجود قطعاً بے فائدہ ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس  
 روشنی کے بغیر ہی محض عقل کے سہارے چلنا چاہتا ہے تو وہ اُس بیوقوف سے کسی طرح کم درجہ کا احمق  
 نہیں ہے جو نہایت شدید تاریکی میں بھی اپنی آنکھوں پر اعتماد کر کے سر پٹ دوڑنا چاہتا ہے۔

ترجمان حقیقت ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا ہے

انجام خرد ہے لے حضورِ ہے فلسفہ زندگی سے دوری  
 افکار کے نغمہ تو ہے صوت ہیں ذوقِ عمل کی واسطے موت  
 دل درخیز محسوس بند لے پورے زبوں علیٰ چاند



## وحی کے لغوی اصطلاحی معنی

وحی کے معنی لغت میں حسب ذیل ہیں :-

الوحيُّ الاشارةُ والكتابةُ والرسالةُ وحی کے معنی اشارہ کرنا، لکھنا، پیغام دینا اور میں ڈالنا

والكلامُ الخفيُّ وكلُّ ما القيتُ الي غيرك چھپا کر بولنا اور جو کچھ تم کسی دوسرے کے خیال میں ڈالو۔

اشارہ کرنا۔ ایک شاعر کہتا ہے :-

تولى عنها عيني فتعرف وحيها وتعرف عيني ما به الوحي يسر جرح

قرآن مجید میں ہے :-

فَاَوْحِيَ إِلَيْهِمَآنُ سُبْحٰوْا بُكْرَةً وَعَشِيًّا تو اشارے سے کہا انکو کہ یا ذکر صبح اور شام

لکھنا۔ عجاج کا شعر ہے۔

حقى غناهمُ جِدُّنا والناجى لقد رى كان وحاد السواحى

”خط اور کتاب“ لیبید کا شعر ہے جو سب سے معلقہ کے چوتھے معلقہ میں ہے۔

فَمَدَّ اِفْعُ الزَّيَّانِ عُمَرَى رَسْمَهَا خَلَقًا مَا ضَمَّنِ الْوَحْيِ سَلَامَهَا

”حکم دینا“ عجاج کہتا ہے۔

وحى لها القرار فاستقرت وسدَّها بالراسيات الثبت

”چھپا کر بات کرنا“ ابو ذؤیب کہتا ہے :-

فقال لها وقد اوحى اليه آلا ليدء أمك ما تعيف

”آواز“ ابوزبیدہ کا مصرعہ ہے۔

مرآة الجراف بسوی اعجم

لیکن اہل لغت کہتے ہیں کہ اس لفظ کے معنی دوسروں سے چھپا کر کسی سے چپکے چپکے بات کرنے کے ہیں کسائی عرب کا محاورہ بتاتا ہے ”وَحِيثُ النَّيِّ بِالْكَلَامِ وَوَحِيَّةُ النَّيِّ هِيَ هَوَانُ تَكَلُّمِ الْكَلَامِ تَخْفِيَةً مِنْ غَيْرِهِ“ یعنی کسی سے اس طرح باتیں کرو کہ اس کو دوسروں سے چھپاؤ۔ ابو اسحاق لغوی کہتا ہے ”وَاصِلُ الْوَحْيِ فِي اللَّغَةِ كَلَّمَا اَعْلَامٍ فِي خَفَاءٍ“ وحی کا اصل مفہوم تمام لغت میں چھپا کر اطلاع دینا ہے۔  
قرآن مجید میں بھی یہ لفظ متعدد معنوں میں آیا ہے۔

شیطان کا وسوسہ پیدا کرنا۔

وَوَحِيَ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ ذَاتَ الشَّيْطَانِ

انکے بعض بعض کو وحی کرتے ہیں اور بڑے شیطانی

اپنے دوستوں کے دلوں میں دستک پیدا کرتے ہیں

لِيُخَوِّنَ إِلَىٰ أَوْلِيَآءِهِمْ

دل میں کسی بات کا ڈال دینا

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ

اور ہم نے موسیٰ کی ماں کے دل میں یہ بات

ڈالی کہ تم ان کو دودھ پلاؤ۔

أَرْضِعِيهِ

اس آیت میں بھی وحی دل میں بات ڈالنے کے معنی میں ہے۔

وَإِذَا وَحْيَتْ إِلَىٰ الْحَوَارِيِّينَ أَنْ

اور جبکہ میں نے (حضرت عیسیٰ) کے حواریوں کے دل میں

یہ بات ڈالی کہ تم مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لے آؤ

آمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي

فطری حکم جس کو وحی نوعی بھی کہتے ہیں۔

وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنْ اتَّخِذِي

اور تمھارے رب نے شہد کی مکھی کو وحی کی کہ تو پہاڑوں

میں گھر بنا لے۔

مِنَ الْجِبَالِ بَيْوتًا

کام پر مقرر کرنا

وَ اَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَاءٍ اَمْرَهَا اور خدا نے ہر آسمان کو اُس کے کام پر مقرر کر دیا  
پھر یہ فطری حکم ذمی روح کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ بے جان چیزوں کے لئے بھی وحی کا لفظ فرمایا گیا  
ہے مثلاً اس آیت میں۔

یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا يَا اَنْتَ اَسْمٰی رَبِّكَ اَوْحٰی لَهَا۔ اُس دن زمین اپنا سب احوال بتائیگی کیونکہ کچے  
رہنے اس کو ان باتوں کی ہدایت دیدی ہے

چُحکے بات کرنا۔

یُوْحٰی بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ ذُرْفًا لِقَوْلٍ یہ ایک دوسرے کو چکنی چڑھی باتیں وحی کرتے مس  
وحی کے یہ معانی لغت کے اعتبار سے تھے لیکن شریعت اسلام کی اصطلاحی میں وحی خاص  
اس ذریعہ شبہی کا نام ہے جس کے ذریعہ غور و فکر، کسب و نظر، اور تجربہ و استدلال کے بغیر خاص اللہ تعالیٰ  
کی طرف سے، اُس کے فضل و لطف خاص سے کسی نبی کو کوئی علم حاصل ہوتا ہے۔ وحی کا استعمال اس معنی  
خاص میں اس کثرت سے ہوا ہے کہ اس معنی میں منقول شرعی بن گیا ہے اور اس لئے جب کسی نبی کے ذکر  
میں وحی کا لفظ بولا جائے گا تو اُس سے لامحالہ یہی معنی مراد ہوں گے چنانچہ قرآن مجید کی آیات اسکی  
شاہد ہیں، اور جس کا ثبوت آئندہ باب سے مل جائے گا

اس کی مثال لفظ صَلوٰۃ و زکوٰۃ اور حج کی سی ہے کہ اگر یہ ان کے لغوی معنی اُن معانی مصطلحہ سے  
مختلف ہیں جن کے لئے اسلامی شریعت میں مخصوص ہو چکے ہیں لیکن اصطلاحی معانی میں انکا استعمال اس  
کثرت سے ہوتا ہے کہ اب ان کے علاوہ کسی معنی میں یہاں تک کہ لغوی معنی میں بھی انکا استعمال صحیح نہیں ہے  
البتہ اِن اگر سیاق یا سباق میں کوئی قرینہ ہو تو اُس وقت کوئی دوسرے معنی مراد لئے جاسکتے ہیں پس سی  
طرح جب وحی کا لفظ مطلقاً بولا جائیگا تو اُس سے مراد یہی اصطلاحی معنی خاص مراد ہونگے لیکن قرینہ کے

موجود ہونے کی صورت میں دوسرے معنی بھی مراد لئے جاسکتے ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے۔

وحی اور الہام کا فرق | اس موقع پر وحی اور الہام کا فرق بھی معلوم کر لینا چاہئے۔ وحی کے معنی اوپر معلوم ہو چکے۔ الہام کے لغوی معنی ہیں "القاراشی فی القلب دل میں کسی چیز کا ڈالنا۔ قرآن مجید میں ہے۔

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا  
اللہ نے نفس انسانی کو بُری باتوں اور نیک

باتوں دونوں کا الہام کر دیا ہے۔

وحی اور الہام میں یہ امر تو مشترک ہے کہ دونوں کسی چیز کے معلوم کر لینے کا ذریعہ فیہ ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ الہام ایسا وجدان ہے جو نفس کو حاصل ہوتا ہے اور جس کے ذریعہ شی مطلوب کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ علم کا مبداء کیا ہے، گویا یہ وجدان بھوک، پیاس، غم اور خوشی کے وجدان کی طرح ہے۔ بخلاف وحی کے کہ اُس میں علم کا مبداء پورے طور پر معلوم ہوتا ہے پھر ان میں ایک ماہ الفرق یہ بھی ہے کہ الہام نبی اور غیر نبی دونوں کو ہوتا ہے لیکن وحی انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے کسی غیر نبی کو علم کا یہ ذریعہ غیبی میسر نہیں ہو سکتا۔

وحی کی حقیقت | وحی کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس کا صحیح علم تو بجز خدا کے اور کسے ہو سکتا ہے البتہ فلاسفہ نے اپنی بساط کے مطابق کچھ پتہ چلانے کی فکر کی ہے لیکن اس کا حاصل اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وحی کے امکان و جواز میں جو بظاہر عقلی استبعاد نظر آتا ہو اُسے دور کریں اور یہ ثابت کر دیں کہ علم و اطلاع کے جس ذریعہ غیبی کو وحی کہتے ہیں اُس کا تحقق انسان کے باطنی قومی اور ملکات کی دریافت و تحقیق کی روشنی میں ناممکن نہیں ہے۔ فلاسفہ یونان کے تتبع میں متکلمین اسلام نے بھی اس روش کو اختیار کیا ہے اور انہوں نے بھی فلسفہ کی تحقیق اور اس کی اصطلاحات کی روشنی میں وحی کی حقیقت کا کھوج لگائی کسی کی ہے تاکہ وہ اُن اعتراضات و شکالات کا جواب دے سکیں جو وحی ایسی مابعد الطبیعی چیزوں پر فلسفہ کی طرف سے کئے جاتے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان ائمہ اسلام کی نیت نہایت مبارک اور پاک تھی، اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف

سے اُن کو اجرِ جزیل بھی عطا ہوگا۔ لیکن اس راہ سے اصل حقیقت کا سُرخ پانے میں کس حد تک کامیاب ہو سکے ہیں؟ اس کا جواب نہایت مشکل ہے۔ ہم ذیل میں محض اسی رفح استبعاد کے نقطہ نظر سے، اور نیز یہ دکھانے کے لئے کہ وحی کی حقیقت کی تشریح و بیان کے سلسلہ میں فلسفہ کہاں تک پرواز کر سکا ہے۔

امام غزالی اور دوسرے متکلمین کی آراء | اس باب میں امام غزالی اور بعض فلاسفہ اسلام کا بیان نقل کرتے ہیں

ب

مقاصد المراد میں ہے۔

وَاللَّوْحِيُّ وَاللَّاهُامُ فَالْفَنَسُ النَّاطِقَةُ	باقی وحی اور اہام تو اُن کی حقیقت یہ ہے کہ
اِذَا كَانَتْ قَوِيَّةً بَجِيَّتْ لَمْ يَكُنْ	نفس ناطقہ جب اس قدر قوی ہوتا ہے کہ بدن
اِسْتِغَالَهَا بِالْبَدَنِ مَا نَعَايِنُ الْاِنْقِصَالَ	کے ساتھ مشغول ہونے کے باوجود مبادی قدریہ
بِالْمَبَادِي الْقَدْرِ سِمَةٌ ذَكَانَتْ الْمُتَخَيَّلَةُ	سے متصل ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھ قوتِ تخیلہ
قَوِيَّةً بَجِيَّتْ تَقْوَى عَلَى اسْتِغْلَاصِ	اس قدر قوی ہوتی ہے کہ جس مشترک کو جو اس
الْحَسَنِ الْمَشْتَرِكِ عَنِ الْحَوَائِصِ لظَاهِرَةً	ظاہری سے نجات دے سکتی ہے تو نفس ناطقہ
اِتَّصَلَتْ حَالَةً النُّفُطَةِ بِالْعُقُولِ	بیداری کی حالت میں بھی عقول مجردہ اور نفوس
الْمَحْسُوتَةِ وَالنُّفُوسِ السَّمَاوِيَّةِ وَجِوَصِلِ	سماویہ سے متصل ہو جاتا ہے اور اس کو غیب
لَهَا اِدْرَاكُ الْمَعْنِيَاتِ عَلَى وَجْهِ كَلْمِي	کی باتوں کا ادراک کلی طور پر ہوتا ہے اور پھر قوت
تَحَرُّمِ الْمُتَخَيَّلَةِ تَحَاكِيهَا بِصُورَةٍ جَزْئِيَّةِ	تخیلہ اس کے مشابہ ایک جزئی صورت پیدا کر لیتی
مُنَاسِبَةٍ لَهَا وَتَنْزِلُ اِلَى الْحَسَنِ الْمَشْرُكِ	ہے یہ صورت حس مشترک میں اتر کر مشاہد اور محسوس
فَقَصِيرٌ مَشَاهِدَةٌ مُحْسُوسَةٌ وَقَدْ يَعْزُرُ	ہو جاتی ہے اور بعضوں کو یہ پیش آتا ہے کہ وہ
بَعْضَهُمْ اِنْ لَسِيْمِعَ كَلَامًا مَنْظُومًا اَوْ يَتَّاهِدُ	مسلل کلام سنتے ہیں یا کوئی اچھی صورت دیکھتے
مَنْظَرًا هَيَّا يَخَاطَبُ بِكَلَامٍ مَنْظُومٍ فَيَا	ہیں جو اُن سے مسلل لفاظ کے ذریعہ سواقیں کرتی ہے

يَتَعَلَّقُ بِأَحْوَالِهِ وَأَحْوَالِ مَا يَقْرَبُ  
 یہ باتیں خود انہیں کے متعلق ہوتی ہیں یا ان کے  
 مُنْتَهَہ تعلقات کے متعلق ۔

اس کے علاوہ معارج القدس میں نبوت کے زیر عنوان امام غزالی نے جو بسط مضمون لکھا ہے اس  
 میں ایک فصل نبوت کے خواص میں ہے اس میں تحریر فرماتے ہیں :-

ولها خواصٌ ثلاثٌ أحدها تَابِعَةٌ نبوت کے تین خالصے ہیں، ایک خاصہ قوت تخیل  
 لقوة التخیل والعقل العملی اور عقل عملی کا تابع ہے ۔

اس کے بعد اس خاصہ کو بہت شرح و بسط سے بیان کیا ہے جس کا حاصل وہی ہے جو مقاصد المراد کی  
 مندرجہ بالا عبارت سے مستفاد ہوتا ہے ۔

ابن سینا کی رائے | اس مضمون کو شیخ ابو علی سینا کے حوالہ سے ابو البقل نے مختصر اور جامع و مانع الفاظ میں  
 اسی طرح ادا کیا ہے چنانچہ تعریفات میں جہاں وحی کی تعریف لکھی ہے لکھا ہے

فحن نرئی الاشیاء بواسطۃ المحسِ ہم حس کے واسطے سے اشیا کو دیکھتے ہیں اور نبی  
 والنبی یرئی الاشیاء بواسطۃ القویہ اشیا کو قوی باطنہ کے ذریعہ دیکھتا ہے  
 الباطنۃ وحن نرئی ثم نعلم والنبی اور ہم دیکھتے ہیں پھر جانتے ہیں اور نبی جانتا ہے  
 یعلم تحریری پھر دیکھتا ہے ۔

اس کے علاوہ شیخ ابو علی بن سینا نے اپنی متعدد کتابوں میں وحی، الہام اور معجزات و معارف عادت پر  
 کلام کیا ہے۔ اشارات کا ایک مستقل عنوان اسی بحث کے لئے وقف ہے۔ سالہ الفعل والانتعال میں لکھا ہے :-

”وحی اور کرامات تاثیر النفسانی فی النفسانی میں داخل ہیں، کیونکہ وحی کی حقیقت یہ ہے کہ

وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کسی امثلی کا القارخفی ان نفوس بشریہ میں ہے جو اس القار کو قبول

کرنے کی استعداد رکھتے ہوں۔ مگر یہ القار جاگنے کی حالت میں ہو تو اسے وحی کہتے ہیں ۔ اور

اگر نیند کی حالت میں ہو تو اس کا نام نفث فی الروع ہے»

(مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ص ۳)

اس کے بعد نفث فی الروع کی چند مثالیں احادیث سے نقل کی ہیں۔

ابن سینا کی یہ وحی کی تعریف نہایت مجمل اور مغالطہ انگیز ہے۔ اپنے ایک اور رسالہ "الرسالۃ الشعریہ" میں خدا کی صفات پر بحث کے ضمن میں صفت کلام پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"خدا کی ساتویں صفت مشکلم ہونا ہے۔ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ وہ ذلت واحد ہے، اور علل اربعہ سے منزہ ہے۔ اس بنا پر اُس کے مشکلم ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کے لئے عبارتیں پائی جاتی ہیں، یا اُس کے لئے نفس کے خطرات اور فکر و تخیل کے ادراکات پائے جاتے ہیں جن پر الفاظ دلالت کرتے ہیں بلکہ خدا کے کلمہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اُس کی طرف سے بواسطہ قلم نقاش جس کو عقل فعال یا مقرب فرشتہ کہتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لوح قلب پر علوم کا فیضان ہوتا ہے پس کلام خدا ان علوم کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ مخصوص ہیں اور علم میں تعدد و کثرت نہیں ہوتا جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَمَا أَمْرًا إِلَّا وَاحِدًا كَلِمَةٍ بِالْبَصِيرَةِ اور ہمارا کام تو بس ایک دم کی بات ہے۔

جیسے لپک نگاہ کی۔

تعدد اور کثرت تو حدیث نفس اور خیال وحس میں ہوتا ہے۔

اصل میں یہ صورت تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرشتہ کے ذریعہ علم غیب کو چائل کرتے تھے اور قوت تخیل اس کو قبول کر کے مختلف حروف و اشکال کی صورت سے مصور کر دیتی تھی، اس کے بعد نفس کی لوح جواب تک خالی ہوتی تھی اس میں یہ عبارتیں و صورتیں منتقل

ہو جاتی تھیں، اب ان سب کا اثر یہ ہوتا تھا کہ آپ منظوم و مرتب کلام سنتے تھے اور ایک انسانی جسم کو دیکھتے تھے پس اسی کا نام وحی ہے، الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نفس مبارک ایک صاف و شفاف صیقل شدہ آئینہ کی طرح تھا جس میں القا کرنے والے اور وہ معانی و مطالب جن کا القا کیا جاتا تھا۔ دونوں صورتوں میں جو جاتے تھے کبھی ان معانی منقشہ کا ظہور عبرانی زبان میں ہوا اور کبھی عربی میں، گویا یوں کہتے کہ مصدر ایک ہے اور مظاہر متعدد ہیں۔ اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نفس یا ذہن کے ذریعہ کس طرح ملائکہ کی رویت کر لیتے تھے، کیونکہ حس کا حال یہ ہے کہ وہ کبھی محسوسات کو جو اس ظاہری کیواسطے سے قبول کرتی ہے اور کبھی مشاعرِ اطمنہ کیواسطے سے، ہم میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں فرق یہ ہے کہ ہم پہلے دیکھتے ہیں پھر جانتے ہیں اور آنحضرت پہلے جانتے پھر دیکھتے تھے۔

(مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ص ۱۲)

حافظ ابن تیمیہ کی رائے | لیکن اس معاملہ میں حافظ ابن تیمیہ نے مجموعۃ الفتاویٰ اور بعض تصنیفات میں زیادہ صاف بیانی سے کام لیا جو انھوں نے ابن سینا اور ارس کے ہم خیال فلاسفہ کی تقلیط کی ہے اور ساتھ ہی امام غزالی پر بحث چینی کی ہے کہ وہ بھی فلسفہ سے مرعوب ہو کر وحی اور نبوت کے باب میں بعض ایسی باتیں بیان کر گئے ہیں جو قرآن و حدیث کی تصریحات کے خلاف ہیں، اس سلسلہ میں امام ابن تیمیہ عقل فعال کے وجود سے انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر عقل فعال کا وجود صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نبوت وہی نہیں کسی ہے

بہر حال قرآن مجید سے وحی کے متعلق جو معلوم ہوتا ہے وہ صرف اسی قدر ہے کہ فرشتہ (جو فلاسفہ کے قول کے مطابق نفس انسانی کی صفات کا نام نہیں بلکہ وہ جو ہر مجردہ اور قائمہ بالذات ہیں) خدا کا پیغام لیکر آنحضرت صلی اللہ پر نازل ہوتا تھا اور آپ کے قلب مطہر پر اس پیغام الہی کا القا کرتا تھا۔



# وحی کی مختلف صورتیں

احادیث سے معلوم ہوتا ہے آپ پر وحی مختلف طریقوں سے نازل ہوتی تھی۔ حافظ ابن قیم نے زاد المعاد جلد اول میں انھیں حدیثوں کے پیش نظر وحی کی حسب ذیل صورتیں بیان کی ہیں۔

- ۱۔ رویائے صادقہ
- ۲۔ نقش فی الروع یا القاء فی القلب
- ۳۔ صلصلة بجرس
- ۴۔ تمثل
- ۵۔ فرشتہ کا اپنی اصل صورت میں نظر آنا۔
- ۶۔ وہ طریقہ مکالمہ جو معراج میں پیش آیا
- ۷۔ بلا واسطہ مکالمہ

اب ہم ہر ایک کو تفصیل سے لکھتے ہیں۔

رویائے صادقہ | رویائے صادقہ کے معنی ہیں سچا خواب، یعنی جو کچھ رات کو خواب میں دیکھا توڑا ہی یا کچھ دنوں کے بعد یعنی اس کے مطابق کوئی واقعہ ظاہر ہو گیا۔ اس خواب کو نبوت کا چھیا السیواں خیر نبیا یا گیا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوسعید الخدری سے روایت ہے: الرؤیا الصالحة جزء من سستی واربعةین جزءاً من النبوة، لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ رویا صادقہ کو نبوت کا جز محض اس لئے فرمایا گیا ہے کہ جس طرح نبی کی خبر بالکل صحیح ہوتی ہے اور اس میں کذب و دروغ کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا

اسی طرح یہ خواب بالکل سچا ہوتا ہے جو رات کو خواب میں نظر آیا۔ دن کو وہی آنکھوں نے دیکھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ روایہ صادقہ کو نبوت کا جزو قرار دیا گیا ہے رسالت کا نہیں کیونکہ نبوت کے معنی بعض غیبی امور سے واقف ہونا اور ان کی اطلاع دینا ہے اور چونکہ روایہ صادقہ میں بھی یہی ہوتا ہے اس لئے اس کو نبوت کا ایک جزو کہا جاسکتا ہے، لیکن رسالت کا مقام اس سے بلند ہے اس کے مفہوم میں احکام شرعیہ کی تبلیغ و اشاعت اور اوامر و نواہی سے لوگوں کو خبردار کرنا داخل ہے۔ ظاہر ہے روایہ صادقہ کا اس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

یہی روایہ صادقہ ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز ہوا۔ صحیح بخاری کے پہلے باب میں حضرت عائشہ سے روایت ہے۔

اول ما بدئ به رسول الله صلى الله عليه وسلم من الوحي الرؤيا الصالحة في النوم فكان لا يرى رؤيا الا جاءت مثل فلق الصبح

سب سے پہلی وہ چیز جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز ہوا نیند میں روایہ صالحہ ہے حضور جو خواب دیکھتے تھے وہ صبح کے تڑکے کی طرح صبح نکلتا تھا۔

لے یہ واضح رہنا چاہئے کہ انبیاء کرام کا خواب ہمارے خواب اور ان کی نیند ہماری نیند کی طرح نہیں ہوتی۔ اس عالم میں ان کی آنکھیں اگرچہ بند ہوتی ہیں لیکن دل بیدار ہوتا ہے۔ بخاری میں ہے۔

تنام اعينهم ولا تنام قلوبهم ان کی آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی نسبت فرماتے ہیں تنام عيني ولا ينام قلبي، اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہئے کہ عربی زبان میں روایہ صرف اس خواب کو کہتے ہیں جو کسی حقیقت کے اخبار و اعلام یا اس کی جانب اشارہ دیا یا پر مبنی ہو، عام خواب جس میں شیطانی وساوس کو زیادہ دخل ہو اسے علم صحیح احلام کہتے ہیں۔ چنانچہ بخاری کتاب الروایہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے۔ (بقیہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ پر)

رویا نے صادقہ سے آغاز وحی کی حکمت | حافظ ابن حجر خواب سے وحی کے آغاز کی حکمت یہ بیان کرتے ہیں کہ عالم بیداری میں حضور پر لور پر جو وحی نازل ہونے والی تھی اس کے لئے بطور تہیہ و توطیہ پہلی وحی خواب کے ذریعہ نازل کی گئی تاکہ آپ اس طرح خوارقِ عادت ایسی چیزوں کے لئے یک گونہ عادی ہو جائیں۔

نفس فی الردع | دوسری صورت یہ ہے کہ فرشتے آپ کے قلب پر بغیر نظر آنے کسی بات کا القاء کر دیتا تھا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "روح القدس نے میرے قلب میں یہ بات ڈال دی کہ کوئی نفس اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک کہ وہ اپنے رزق کی تکمیل نہیں کر لے گا پس تم اللہ سے ڈرو اور طلب میں خوش روشی سے کام لو اور خبردار رہو کہ کہیں رزق کا متاخر ہو جانا تم کو اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ اللہ کی محصیت کی راہ سے اس رزق کو طلب کرو کیونکہ اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کی طاعت و بندگی سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

الرویا من اللہ والمحل من الشیطان | روایا اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور حل من شیطان کی طرف سے پھرن خوابوں میں جو خوابہائے پریشان ہوتے ہیں انہیں اضغاثِ احلام کہتے ہیں۔ سورہ یوسف کی آیت ذیل میں تینوں لفظ جمع ہو گئے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الْمَلَأَ أَعْيُنِي فِي رَأْيِ اِنْ كُنْتُمْ لِلرَّيَا تَعْبُرُونَ ۚ قَالُوا اَضْغَاثِ اِحْلَامٍ  
وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ اِلْحَامِهِ بِعِلْمِنَا  
لے دبا رہا اگر تم خوابوں کی تعبیر بیان کر سکتے ہو تو میرے خواب کے بارے میں اپنی رائے بیان کرو۔ ان لوگوں نے کہا: یہ تو اوام پریشان ہیں اور ہم ان اوام و خیالات کی تعبیر نہ کر سکتے۔

لیکن حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کی تحقیق یہ ہے کہ روایا کے معنی خواب کے نہیں ہیں بلکہ وہ ایک ایسی حالت کا نام ہے جو نہ پوسے طور پر بیداری ہو اور نہ کامل نیند بلکہ ان دونوں کی ایک درمیانی حالت ہے حضرت الاستاذ فرماتے ہیں کہ یہ میرا ذاتی خیال تھا لیکن مدت کے بعد علامہ فرید وجدی کی دائرۃ المعارف دیکھنے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ میں جو کچھ روایا کی حقیقت

صلصلة الجرس | تیسری صورت یہ تھی کہ وحی صلصلة الجرس یعنی گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی تھی صحیح بخاری میں ہے

”حارث بن ہشام نے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ پر وحی کس طرح نازل ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا ”کبھی کبھی وحی میرے پاس گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی ہے اور میرے اوپر سخت ترین ہوتی ہے جب یہ مجھ سے منقطع ہوتی تھی تو فرشتہ جو کچھ کہتا تھا وہ سب مجھ کو یاد ہو جاتا تھا (باب براء الوحی)

وحی کی اس خاص نوعیت کو سمجھنے کے لئے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ صلصلة اصل میں اس آواز کو کہتے ہیں

جو لوہے کے ایک ٹکڑے کو دوسرے ٹکڑے پر مارنے سے پیدا ہوتی ہے لیکن پھر اس میں توسع کر لیا گیا ہے اور

اس لفظ کا اطلاق ہر اس آواز پر ہونے لگا ہے جس میں جھنجھناہٹ (طنین) ہو۔ وحی کی آواز کو اس آواز

سے تشبیہ دی گئی ہے اور وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح گھنٹہ کی آواز صوت محض کی صورت میں سنائی دیتی ہے اور

اُس کا کوئی مبداء و مقطع نہیں ہوتا۔ اسی طرح وحی یا پیغامِ وحی کی اس آواز میں بھی کوئی مبداء یا مقطع نہیں

ہوتا تھا۔ اس بنا پر یہ آواز مرکب نہیں بلکہ بسیط ہوتی تھی۔ شیخ اکبر محمد الدین بن عربی نے وجہ شبہ یہ بیان

کی ہے کہ جس طرح گھنٹہ کی آواز کے لئے کوئی جہت خاص نہیں ہوتی بلکہ وہ تمام جانب و جہات سے سنائی

دیتی ہے اسی طرح وحی کی اس آواز کے لئے بھی کوئی جانب یا جہت نہیں ہوتی تھی حضرت الاستاذ نے

اس وجہ شبہ کو نہایت لطیف کہا ہے ”لیکن خود ایک جگہ فرماتے ہیں۔

وصلصلة الجرس ههنا كنفرات اور نزل وحی کی وقت گھنٹہ کی سی آواز ٹیلیگرام کی گھڑ گھڑا

التلخراف كاداء الرسالۃ کی طرح ہے جو پیغامِ رسائی کے لئے کی جاتی ہے۔

اس تشبیہ سے اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ تار کی گھڑ گھڑاہٹ میں آواز تو سنائی دیتی ہے لیکن

بولنے والا نظر نہیں آتا۔ اسی طرح وحی کی اس صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محض آواز سنتے تھے

لیکن بولنے والا نظر نہ آتا تھا۔

اس حالت کی شدت | جیسا کہ صلصلۃ الجرس والی حدیث میں مذکور ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حالت بہت شاق گذرتی تھی حضرت عائشہ فرماتی ہیں "آپ پر وحی نازل ہوتی تھی اور دن نہایت سرد ہوتا تھا پھر بھی (وحی کے بارے) آپ پر دباؤ اس قدر شدید ہوتا تھا کہ آپ کی پیشانی سے پسینہ بھوٹ نکلتا تھا، اور اگر آپ کسی سواری پر ہوتے تھے تو سواری بوجھ کے مارے زمین پر بیٹھ بیٹھ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی طرح وحی آئی حضرت زید بن ثابت اُس وقت آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور سید کوئین کا فرق مبارک ان کی ران پر تھا حضرت زید پر وحی کا اتنا شدید بار ہوا کہ اُن کا جسم دبا جاتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پارہ پارہ ہو جائے گا۔

حضرت عبادۃ بن صامت کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ کو اضطراب پیدا ہو جاتا اور چہرہ مبارک کا رنگ بدل جاتا۔ آپ اس وقت سر جھکالیتے اور جو صحابہ آپ کے پاس بیٹھے ہوتے تھے وہ بھی سر نیچا کر لیتے تھے، وحی کے بعد آپ سر اٹھاتے تھے بلکہ

صفوان بن یعلیٰ بن اُمیہ بیان کرتے ہیں کہ یعلیٰ کو بڑی خواہش تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی ہوئی دیکھیں، خدا نے اُن کی مراد پوری کی۔ ایک مرتبہ جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجرانہ میں قیام فرماتے تھے یعلیٰ کو یہ سعادت نصیب ہو گئی اُس کی تفصیل یہ ہے کہ حجرانہ کے دوران قیام میں اُن حضرت صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص آیا جس نے خوشبو لگا رکھی تھی اور سوال کیا "لے رسول اللہ آپ اس شخص کی نسبت کیا فرماتے ہیں جس نے ایک خوشبو لگے ہوئے جبہ میں ہی احرام کی نیت کر لی" یہ سوال سنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑی دیر انتظار فرمایا، یہاں تک کہ آپ پر یکایک وحی نازل ہوئی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ حضور کا چہرہ مبارک سُرخ ہوا اور سانس کھا تیز ہو گیا جیسے کوئی تھکا ہوا ہو، تھوڑی دیر کے بعد جب یہ کیفیت دور ہو گئی تو آپ نے سائل کو بلا کر

لے یہ واقعہ حافظ ابن حجر نے مستح الباری میں کیف نزل الوحی کے تحت ہی بیان کیا ہے۔

اُس کے سوال کا جواب دیا۔

ایک سوال اور اس کا جواب | اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وحی وحی تو سب برابر ہے پھر اس کی وجہ کیا ہے کہ آپ پر وحی کی یہ قسم (مصلحت البحرس) بقیہ طرق وحی کی نسبت زیادہ گراں گذرتی تھی؟ اگر ایک نوع وحی کا تحمل بڑھ سکتا تھا تو اس نوع وحی کا تحمل کیوں دشوار تھا؟ اس کا جواب جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے، یہ ہے کہ انسان میں دو قوتیں ہیں ایک قوت بشریت اور دوسری قوت ملکیت، پھر فرشتے جب ان نفوسِ قدسیہ پر نازل ہوتے ہیں جن میں نبوت کی استعداد ہوتی ہے تو ان کو ظلمت بشری سے نکل کر عالم نور میں آنے کی وجہ سے سخت کش مکش اور مزاحمت باطنی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کش مکش کی وجہ سے ان کے تمام اعصاب متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال اس طرح سمجھئے کہ انسان نیند کی حالت میں کوئی ہیبت انگیز خواب دیکھتا ہے تو اگرچہ اُس خواب کا تعلق جسم سے نہیں ہوتا لیکن نفس کے تعلق بالجسم کے باعث اس خواب کا اثر جسمانی اعضا و جوارح پر بھی ظاہر ہوتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے مصلحت البحرس کی تشریح بھی اسی تاثر و انفعال کی روشنی میں کی ہے۔ فرماتے ہیں -

واما المصلحة فحقیقۃ ہا ان الحواس

اذا صادمہا تاثر قوی تشویش فتشوش

قوة البصر ان یرى الواثا الجمرة والصفرة

والخضرة ونحو ذالك وتشویش قوۃ

السمع ان یسمع اصواتا مبہمة كالطنین

والمصلحة والمہمة فاذا اثر الالات

رہ مصلحتہ تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ حواس سے

جب کوئی قوی تاثر متصادم ہوتی ہے تو وہ تشویش

ہو جاتے ہیں چنانچہ قوتِ بصر کی تشویش یہ ہے کہ

مختلف رنگ مثلاً سرخی، زردی اور سبزی نظر

آئیں وغیرہ ذالک اور قوتِ سمع کی تشویش یہ

ہے کہ مبہم آوازیں سنائی دین مثلاً طنین مصلحتہ

## حاصل العلم

اور ہمہ پہر جب اثر تمام ہو جاتا ہو علم حاصل ہو جاتا ہو  
حجۃ اللہ البالغہ میں ہی ایک دوسرے مقام پر باب الایمان بصفات اللہ تعالیٰ کے ماتحت یہی مضمون  
کو اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

درتبا یحصل عند توجہ سالی الغیب اور بسا اوقات نبی کے غیب کی طرف متوجہ ہونے  
وانفہار الحواس صوت صلصلة الجرس اور حواس کے مغلوب ہونے کی صورت میں گھنٹہ  
کما قد یكون عند عرض الغشی من کے بچنے کی سی آواز آتی ہے جیسا کہ غشی کے عالم  
روية الوان حمرو سوید میں سُرخ اور سیاہ رنگ نظر آتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کی مراد یہ ہے کہ یہ وہ خاص وقت ہوتا تھا جبکہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم عالم  
مادیت سے ورار الوراہ ہو کر ملارا اعلیٰ سے بہت زیادہ قریب ہو جاتے تھے اور اُس وقت اگرچہ آپ  
کے حواس ظاہری میں تشویش پیدا ہو جاتی تھی لیکن ساتھ ہی آپ کی تمام روحانی قوتیں باطنی احساس  
و شعور اور ملکوتی صفات و خصائص مکمل طور پر عالم لاہوت کے جلوہ زار میں پہنچ جاتے تھے اور وہاں  
آپ وہ سنتے تھے جسے دوسرے نہیں سُن سکتے اور ان حقائق سے علی وجہ یقین آشنا ہوتے تھے جنکو  
نہ مادی حواس محسوس کر سکتے ہیں اور نہ جسمانی آلات ادراک و شعور انھیں دریافت کر سکتے ہیں اور چونکہ وقت  
آپ کی جہت بشری اور جہت ملکوتی میں تصادم ہوتا تھا اس لئے اُس کا اثر آپ کے عصار و عصاب پر  
بھی پڑتا تھا اور اس اثر کے باعث آپ کو گھنٹہ کی سی آواز سنائی دیتی تھی جہیں اقدس عرق آلود ہو جاتی  
تھی اور اس تاثر میں اس درجہ شدت ہوتی تھی کہ آپ کے پاس جو صاحب بیٹھے ہوتے تھے انھیں بھی اس  
حالت کا بین طور پر احساس ہوتا تھا جب کہ کش ختم ہو جاتی تو آپ کی یہ حالت یعنی عصاب کا تاثر  
بھی زائل ہو جاتا تھا اور تمام وحی من وعن آپ کو یاد ہو جاتی تھی چنانچہ حدیث کے الفاظ

فیفصم عنی وقد وعیت عنہ  
 وحی مجھ سے جب منقطع ہو جاتی تھی تو مجھ کو اس وقت  
 سب کچھ یاد ہو جاتا تھا۔

میں اس امر کا ہی اظہار فرمایا گیا ہے کہ لوگوں کو مصلحت البحرس کے لفظ سے یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ آپ  
 محض آواز سنتے تھے اور وحی کا مضمون نہیں سمجھتے تھے۔ یا وحی کا مضمون اس وقت سمجھ لیتے تھے،  
 لیکن وہ آپ کو محفوظ نہیں رہتا تھا۔ غور کیجئے بصیغہ ماضی وَعَیْتُتُ فرمانا اس مضمون کو زیادہ موگلا اور  
 موثّق طریقہ پر بیان کرنے کے لئے ہی ہے۔

مزید شرح | مصلحت البحرس کی مخصوص نوع وحی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مقام پیش آتا  
 تھا اس کا تعلق محض روح اور نفس سے ہو اس لئے اس کی تشریح اگر کوئی کر سکتا ہے تو صرف وہی  
 شخص کر سکتا ہو جو اپنی باطنی اور روحانی قوتوں کے باعث عقل اور نفس کے ملکات اور عالم تجربہ کے  
 ساتھ ان دونوں کے تعلقات سے آگاہ ہو۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے بڑھ کر ان اسرار و رموز کا  
 محرم کون ہوگا! آپ حجۃ اللہ البالغہ کی جلد دوم بحث فی المقامات والاحوال میں فرماتے ہیں۔

ان القلب لہ وجہان وجہ یمیل	قلب کے دو رخ ہیں۔ ایک رخ بدن اور اعضا کی
الی البدن الجوارح ووجہ یمیل	طرف مائل رہتا ہے اور دوسرا رخ تجربہ اور صرافت
الی التجرح والصرافۃ وکذا لک العقل	کی طرف متوجّہ رہتا ہے اسی طرح عقل کے بھی دو رخ ہیں
لہ وجہان وجہ یمیل الی البدن	ایک رخ بدن اور حواس کی طرف مائل ہوتا ہے اور
والحواس ووجہ یمیل الی التجرد	دوسرا رخ تجربہ اور بساطت محض کی جانب،
والمصرافۃ فستوا ما یلی الجانب السفلی	پس جو رخ جانب اسفل سے متصل ہے اسے قلب
قلباً وعقلاً وما یلی الجانب الفوق	اور عقل کہتے ہیں اور جو جانب فوق سے ملا ہوا ہے
روحاً ولسراً فصفۃ القلب الشوق	روح اور سر کہتے ہیں اور تلب کی صفت شوق



المزج والوجد وصفه الروح  
 الانس والانس والانس والانس  
 اليقين بما يقرب ماخذ من ماخذ  
 العلوم العادية كالامكان  
 بالغيب والتوحيد الاعمال وصفته  
 التشرية وهو ما يجعل عن العلوم  
 العادية وانما هو حكاية ما عن  
 المجرم الصريف الذي ليس في  
 زمان ولا مكان ولا يوصف  
 بوصف ولا يشتر اليه باشارة  
 بلے پایاں اور وجد ہے، روح کی صفت مانوس و  
 مجذب ہونا ہے اور عقل کی صفت ان چیزوں پر  
 یقین کرنا ہے جن کا ماخذ علوم عادیہ (رسمیہ) سے  
 قریب ہو جیسے ایمان بالغیب اور توحید انفعالی  
 اب رہا برسر تو اس کا کام ان حقائق کا مشاہدہ کرنا ہے  
 جو علوم عادیہ سے بلند بالا ہیں، اس کے معنی بجز  
 اس کے کچھ اور نہیں کہ یہ اُس مجرد محض سے حکایت  
 ہوتی ہے جو نہ زمان میں ہے اور نہ مکان میں اور  
 جو نہ کسی وصف سے موصوف کیا جا سکتا ہے اور  
 نہ جس کی طرف کوئی اشارہ ہو سکتا ہے۔

غور کیجئے! حضرت شاہ صاحب نے کس خوبی اور وضاحت سے بتایا ہے کہ روح کی صفت انس اور  
 انجذاب ہے اور سر کی صفت شہود و معائنہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھئے کہ روح کی صفت انفعالی ہے  
 اور سر کی صفت فعلی ہے۔ ان کیفیتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی سعادتمند روح پر جب آفتاب حقیقت پر تو  
 فگن ہوتا ہے تو اس کی شعاعیں شبنم کے قطروں کی طرح اس روح کو اپنے جلوہ گاہ انوار میں جذب کرتی  
 ہیں۔ پھر عقل کا دوسرا رخ جو جانب فوق سے متصل ہے یعنی برسر، وہ ابھرتا ہے اور اب وہ اُس مجرد و صرف  
 سے حکایت کرنے لگتا ہے تو لا عین ذات ولا اذن سمعت کا مصداق ہے اور زمان و مکان کی حد  
 بند یوں سے بلند و بالا ہے۔

اس موقع پر یہ بات نہ بولنی چاہئے کہ قلب و عقل یہ دونوں جس طرح انبیاء میں ہوتے ہیں  
 اور انسانوں میں بھی ہوتے ہیں لیکن فرق یہ ہوتا ہے کہ انبیاء کرام میں قلب و عقل کا وہ رخ جو روح اور برسر

کہلاتا ہے اس درجہ بلند اور قوی ہوتا ہے کہ کسی اور انسان میں یہ بات نہیں ہوتی، اس بنا پر انکو عالم فوق سے اتصال ہوتا ہے اور انھیں ایسے ایسے مقامات اور احوال میں لایا پیش آتے ہیں جو دوسروں کے دہسم و گمان میں بھی نہیں آسکتے۔ قرآن مجید میں حضور پر نور کی زبان حق ترجمان سے جو ارشاد فرمایا گیا ہے اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ اِلَيَّ، تو اس میں اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اعضا و جوارح میں انسانوں کے ساتھ مشارکت کی بنا پر ہے اور پھر یوحی الی جو فرمایا گیا ہے تو اس میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب و عقل کے دو فوقانی رخ جو حضرت شاہ ولی اللہ کی زبان میں روح اور شہر ہیں وہ اس درجہ بلند اور رفیع ہیں کہ آنحضرت مہبط وحی ہیں۔

مگر بات یہ ہے کہ انسان، انسان ہونے کے باوجود جس طرح ایک بزدل انتہائی بہادر انسان کے شجاعانہ کارناموں کو، ایک غبی پر لے درجہ کی ذکاوت و ذہانت رکھنے والے انسان کی دماغی بلند پروازیوں اور ذہنی کمالات کو نہیں سمجھ سکتا، اور جب ان کا ذکر سنتا ہے تو حیرت و استعجاب سے انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح ”مجرد صرف“ ذات حق اور حقیقت مطلقہ سے قرب و اتصال کے باعث انبیاء کرام پر جن اسرار الہیہ کو نبیہ کا فیضان ہوتا ہے، ہم لوگ جب ان کا ذکر سنتے ہیں تو ہمیں حیرت ضرور ہوتی ہے اور بسا اوقات وہ امور ہمارے لئے ناقابل فہم ہوتے ہیں لیکن ہمیں یہ بات کبھی فراموش نہ کرنی چاہئے کہ ہمارے لئے کسی چیز کا ناقابل فہم ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ اس کے وجود کا انکار ہی کر دیا جائے۔ مولانا شبلی مرحوم نے صحیح بخاری کی حدیث وحی پر کلام کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیا دیکھا؟ ناموس غلم (حضرت جبریل) نے کیا کہا؟ کیا کیا مشاہدات ہوئے؟ یہ وہ نازک باتیں ہیں جو الفاظ کا تحمل نہیں کر سکتیں، ایک مادرزاد اندھے کو روشنی کی حقیقت لاکھ کھو لکر سمجھانے کوئی بات اسکے ذہن نشین نہیں ہوتی تو کیا مصلح بنی اسرائیل کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ روشنی کے وجود کا ہی سرے سے انکار کر دے۔

یہ آواز کس کی تھی | سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا وہ حضرت شاہ ولی اللہ کے بیان کی روشنی میں مصلحتاً لہجہ اس کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں تھا حضرت شاہ صاحب نے نفس آواز سے بحث نہیں کی یعنی یہ نہیں بتایا کہ یہ آواز خدا کی تھی یا فرشتہ وحی کی، یا خود وحی کی آواز تھی یا انھوں نے صرف اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ یہ آواز خواہ کسی کی ہو اس کو زبان نبوت نے گھنٹہ کی آواز سے کیوں تشبیہ دی ہے اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مختصراً اس کا بھی ذکر کر دیا جائے کہ یہ آواز کس کی تھی؟ اس باب میں سب سے زیادہ نمایاں مسلک امام بخاری کا ہے آپ فرماتے ہیں کہ یہ آواز خدا کی ہوتی تھی جو تمام فضائل گونج جاتی تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور اس کو نہیں سن سکتا تھا چنانچہ صحیح بخاری کتاب التوحید میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی یہ روایت نقل کرتے ہیں۔

اذا تكلم الله بالوحى سمع اهل السموات  
شيئا فاذا فرغ قلوبهم وسكن الصوت  
عرفوا انه الحق ونادوا ما ذا قال  
ربك قالوا الحق  
اللہ تعالیٰ جب کلام بالوحی کرتا ہے تو اہل سموات کچھ  
سننے ہیں پھر جب ان کے قلوب سے خوف دہراں کم  
ہو جاتا ہے اور آواز ٹھہر جاتی ہے تو وہ پہچانتے ہیں کہ  
یہی حق تھا اور وہ آپس میں مذا کرتے ہیں کہ تمہارے  
رب نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں کہ حق کہا!

اس سلسلہ میں امام بخاری نے ایک روایت بھی نقل کی ہے جو عبداللہ بن امیس سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں کو جمع کرے گا اور ان کو ایسی ندادیگا کہ قریب و بعید سب اُسے کیساں سنیں گے، پھر آگے چل کر ایک باب کا ترجمہ "وكلّم الله موسى تكليماً" باندھا اور اس کے ذیل میں چند احادیث نقل کیں جن سے اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ چونکہ آیت بالا میں کلام فعل کی تاکید مصدر تکلیم کے ساتھ لائی گئی ہے اس لئے علم نحو کے قواعد کے مطابق یہاں کلام سے مراد حقیقت ہے مجاز نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے وادی سینا میں جو آواز سنی تھی وہ سچ سچ خدا ہی کی آواز تھی

امام بخاری نے فرقہ جمیہ کی تردید میں کتاب التوحید میں اور بھی احادیث پیش کی ہیں اور ان سے خدا کے لئے صوت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اس بنا پر صلصلة الحجرس والی حدیث میں جس آواز کا ذکر ہے وہ امام بخاری کے نزدیک خدا کی ہی آواز ہے۔

ارباب تصوف و عرفان میں شیخ اکبر کا جو مقام ہوا اہل علم سے پوشیدہ نہیں، وہ بھی خدا کے لئے صوت مانتے ہیں۔ چنانچہ وحی پر کلام کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ اللہ کی آواز کے لیے کوئی جہت اور سمت متعین نہیں کیجا سکتی اور چونکہ گھنٹہ کی آواز کا حال بھی یہی ہے کہ وہ ہر طرف سے سُنی جاتی ہے اس بنا پر ہی صوت بالوحی کو گھنٹہ کی آواز سے تشبیہ دی گئی ہے، لیکن علماء کی اکثریت جس میں صحیح بخاری کے شارحین بھی داخل ہیں اس بات کی قابل ہے کہ یہ آواز فرشتہ وحی کے پروں کی۔ یا فرشتہ کی زبانی وحی کی ہوتی تھی۔ حافظ ابن حجران میں سے پہلی شق کے قابل ہیں۔ واللہ اعلم۔

تمثل یعنی فرشتہ کا کسی وحی کا چوتھا طریقہ یہ تھا کہ فرشتہ وحی کسی انسان کی شکل و صورت میں آتا تھا اور وہ انسانی شکل میں آتا آپسے خطاب کرتا تھا یہاں تک آپ کو وہ پوری بات یاد ہو جاتی تھی جو وہ آپسے کہتا تھا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آیا جس کے کپڑے بہت زیادہ سفید اور بال بہت سیاہ تھے اس پر کوئی علامت سفر بھی نہیں تھی اور ہم میں سے کوئی ایک شخص بھی اُسے نہیں جانتا تھا۔ یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر اس طرح بیٹھ گیا کہ اپنے گھٹنے حضور کے گھٹنوں پر ٹیک لئے اور اپنے دونوں ہاتھ آپ کی رانوں پر رکھ دیئے پھر اسلام، ایمان، احسان، قیامت اور علامات قیامت کے متعلق آپسے چند سوالات کئے۔ آپ ان سوالات کے جوابات دیتے جاتے تھے اور سائل ہر جواب پر ”صَدَقْتَ“ (آپ نے سچ فرمایا) کہتا جاتا تھا، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں بڑا تعجب ہوتا تھا کہ یہ شخص سوال کرتا ہے اور جواب ملنے پر تصدیق بھی کرتا جاتا ہے گویا کہ اُسے ان سوالات کے جوابات کا علم پہلے سے ہی تھا۔ سوال د

جواب کے ختم ہونے پر شخص واپس چلا گیا تو آنحضرت نے حضرت عمرؓ سے دریافت فرمایا "تم جانتے ہو کہ یہ کون شخص تھا؟" انھوں نے جواب دیا "اللہ اور اس کا رسول اعلم ہیں" آپ نے فرمایا "یہ جبریل تھے جو تم کو دین سکھانے آئے تھے"

صحابہ میں حضرت وحیہؓ خوبصورتی اور حسن و جمال کے لحاظ سے ممتاز تھے۔ اس لئے فرشتہ وحی کبھی کبھی ان کی شکل میں بھی آتا تھا۔ صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے کہ ایک مرتبہ جبریل امین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور باتیں کرنے لگے۔ اس وقت آنحضرت کے پاس ام سلمہ بیٹھی ہوئی تھیں آپ نے ان سے پوچھا "یہ کون ہیں" وہ بولیں "یہ تو وحیہ ہیں" ام سلمہ کا بیان ہے کہ بخدا میں انکو وحیہ ہی سمجھتی رہی یہاں تک کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ سنا جس میں آپ نے جبریل امین کے آنے کی خبر دی۔ تب میں سمجھی کہ جبریل وحیہ کی شکل میں آئے تھے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے ساتھ پیش آیا، ایک مرتبہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ ایک شخص سے گفتگو کر رہے ہیں جو سواری پر سوار ہے جب گھر واپس آئے تو ام المومنین نے پوچھا "یہ کون شخص تھا جس سے آپ گفتگو کر رہے تھے؟ ارشاد ہوا "یہ جبریل تھے انھوں نے مجھ کو حکم کیا ہے کہ میں بنو قریظہ کی طرف چلا جاؤں۔"

فرشتہ کا اپنی اصلی شکل میں آنا وحی کا پانچواں طریقہ یہ تھا کہ فرشتہ اپنی اصلی شکل میں آتا تھا اور اللہ کا پیغام آپ تک پہنچاتا تھا۔ حضرت عائشہ کا بیان ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل کو ان کی اصلی شکل میں دو مرتبہ دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ واقعہ معراج میں سدرۃ المنتہی کے پاس اور ایک دفعہ کسی اور مقام پر غالباً اجیاد میں بعض علماء کی رائے ہے کہ قرآن مجید میں سورہ النجم کی مندرجہ ذیل آیات انھیں

۱۰ باب کیف نزل الوحي

۱۱ یہ واقعہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں کیف نزل الوحي کے تحت نقل کیا ہے۔

دو واقعوں سے متعلق ہیں معراج کے علاوہ آنحضرت نے جو جبریل امین کو ان کی کو انکی اصلی شکل میں دیکھا تھا اس کا ذکر ان آیات میں ہے۔

عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ  
وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ  
فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ  
فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ مَا كَذَبْنَا  
الْفُؤَادَ مَا رَأَىٰ أَفْتَمْرُونَهُ عَلَىٰ  
مَا يُرَىٰ

انکو بڑی طاقتوں والے اور مضبوطی سے تعلیم دی پھر وہ سیدھا ہو گیا اور وہ بہت اوپر آسمان کے کنارہ پر تھا۔ پھر وہ قریب ہوا اور لنگ گیا۔ اب فاصلہ دو کمپانوں کے برابر یا اس سے بھی کم تھا اور اب خدا نے اپنے بندہ پر وحی کی۔ جو کہی۔ دل نے جو کچھ دیکھا اُسے جھوٹ نہیں کہا۔ کیا تم لوگ پیغمبروں سے ان چیزوں پر جھگڑتے ہو جو انھوں نے دکھی ہیں۔

ان آیات میں جبریل امین کی جو صفات بیان کی گئیں ہیں سورہ تکویر میں بھی ان میں سے بعض کا ذکر ہے ارشاد ہے

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ذِي قُوَّةٍ  
عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ مُّطَاعٍ  
ثَمَّ آمِينٍ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ  
وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ

یہ کہا ہوا ہے ایک کریم قاصد کا جو طاقتور ہے۔ اور جو عرش کے مالک خدا کے نزدیک مرتبہ والا ہے اس کی اطاعت کی جاتی ہے اور وہ وہاں امانت دار ہے اور تھکے ساتھی (آنحضرت) مجنون نہیں ہیں۔

انھوں نے فرشتہ کو اُفق میں پر دیکھا ہے

سورہ النجم اور سورہ تکویر کی ان آیتوں پر غور کیجئے، ان میں یہ بات مشترک ہے کہ جبریل امین کی صفت ذی قوۃ اور امین بیان کی گئی ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ آنحضرت نے ان کو اُفقِ اعلیٰ پر دیکھا ہے اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ اس مرتبہ فرشتہ وحی کا نزول کسی غیر معمولی اور عظیم و

جلیل شکل میں ہوا اور دوسری یہ کہ فرشتہ نے خود اپنی زبان سے وحی کا تلفظ کیا تھا، اِنَّهُ لَقَوْلِ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے، پھر دونوں صورتوں میں فرشتہ کے ورود و نزول کے بیان کے بعد اسکی بھی تصریح کر دی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا اور سنا وہ سترتا سرحق تھا اور آپ کا دل ایک ایک بات کی تصدیق کر رہا تھا اسے کوئی اشتباہ نہیں تھا۔

دوسرا واقعہ حضرت جبریل کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے کا جو معراج میں پیش آیا اس کا ذکر اس آیت میں ہے۔

وَلَقَدْ رَاَهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ      اور آنحضرت نے دوسری مرتبہ بھی اترتے ہوئے  
عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَىٰ عِنْدَهَا      جبریل کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا ہے جس کے  
جَنَّةِ الْمَأْوَىٰ إِذْ يَخْشَى السِّدْرَةَ      پاس جنتہ الماویٰ ہے اسوقت سدرہ پر عجیب  
مَا يَخْشَى مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ      غریب النوار چھپائے ہوئے تھے (مگر) نہ نگاہ ہلکی  
اور نہ اُس نے سرکشی کی۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، علماء کے ایک گروہ کا خیال یہی ہے کہ سورۃ النجم کی آیات بالا دونوں واقعوں سے متعلق ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت سے اس کی تصدیق و تائید بھی ہوتی ہے لیکن اس مقام پر ایک شبہ یہ ہو کہ فادوحی الی عبدہ ما اوحیٰ میں اگر اوحیٰ کی ضمیر مرفوع مستتر کو جبریل کی طرف لوٹایا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وحی کے کرنے والے جبریل امین ہیں حالانکہ اسی سورۃ کے شروع میں عَلَّمَكَ شَدِيدَ الْقُوَىٰ، فرما کر ان کی حیثیت موحیٰ کی نہیں بلکہ معلم کی بتائی گئی ہے اور قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی ایحاء کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف کی ہو مثلاً ایک مقام پر "وَإِنْ اهْتَدَيْتُمْ فَمَا يُوحَىٰ إِلَىٰ رَبِّي" ایک جگہ "ذَٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ" ایک سورۃ میں ہے "وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ"

ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے "ذَلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ" اگر کہیں نُوحِي بِہ صیغہ مجہول لایا بھی گیا ہے تو وہاں بھی "مِنْ رَبِّي" فرما کر اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہو کہ ایجا اللہ تعالیٰ کا ہی فعل ہے جیسے اس آیت میں: "قُلْ إِنَّمَا آتَيْتُكُمْ مَا يُوْحِي إِلَيَّ مِنْ رَبِّي" ہاں! اس میں شک نہیں کہ بعض آیات میں ایجا کی نسبت خود حیرل امین کی طرف بھی کی گئی ہو لیکن ایسے واقع پر ان کی حیثیت رسول بھی متعین کر دی گئی ہو اور ساتھ ہی خدا کا ذکر بھی جیسے اس آیت اویُسِّلْ دَسُوْلًا فَيُوْحِي بِأَذْنِهِ مَا يَشَاءُ اس سے مقصد یہ ہے کہ جہاں التباس و اشتباہ کا خدشہ نہ ہو حیرل امین کی طرف ایجا کی نسبت کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

یہ اور اس طرح کے بعض اور اشکالات کے باعث سورۃ النجم کی یہ آیات بھی مشکلات قرآن میں شمار کی گئی ہیں جن پر افسوس ہے کہ مفسرین اور علماء سیرت نے کچھ زیادہ توجہ نہیں کی اور جو کلام کیا ہے وہ محض سطحی اور سرسری ہے۔ اس موقع پر ہم ذیل میں مختصراً وہ تقریر نقل کرتے ہیں جو حضرت الاستاذ مولانا سید انور شاہ کشمیری نے "مشکلات القرآن" میں کی ہو اور جسے مولانا شبیر احمد عثمانی نے فتح الملہم کی جلد اول میں صفحہ ۳۳۵-۳۳۶ پر نقل کیا ہے۔ حضرت الاستاذ فرماتے ہیں:-

علامہ کشمیری کی تقریر | اس سورۃ میں نجم (ستارہ) کی قسم اس لئے لگائی گئی ہے کہ اس کے بعد جو کلام ہے وہ آسمان کی خبر اور معراج وغیرہ سے متعلق ہے۔ ان آیتوں کا خلاصہ اور لب لباب یہی چیز ہے  
 ہِیْنَ اِنْ هُوَ اِلَّا وُحٰی یُوْحٰی فِیْ فِعْلِ بِہ صیغہ مجہول لایا گیا اور وُحٰی کی کوئی تعین نہیں کی گئی، کیونکہ ایجا بجز اللہ تعالیٰ کے کسی اور کے لئے ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ وصف خدا میں منحصر ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جو اوصاف موصوف کی ذات میں منحصر ہوں ان کا ذکر خود موصوف کے تسمیہ سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے مثلاً قہر رب باکرم القوم اس کے بعد فرمایا گیا "عَلَّمَ شَدِيدُ الْقُوٰی" اس میں وُحٰی کے ذکر کے بعد مُعَلِّم کی طرف۔



انتقال ہے۔ کیونکہ یہاں دو گرامی شخصیتوں کا ذکر ہے، ایک اللہ تعالیٰ جو موحی ہو اور دوسرا  
 معلم جو جبریل ہیں۔ اس کے بعد معلم کے اوصاف بتائے گئے کیونکہ کلام اہل مکہ کے ساتھ  
 ہے اور یہ لوگ جبریل کی معرفت نہیں رکھتے تھے اس لئے جبریل کا فعل اور ان کی صفات  
 بیان کی گئی اور یہی وہ اوصاف ہیں جو سورہ تکویر میں بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ان آیات  
 کا مقصد گویا یہ بتانا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کس طرح آتی تھی؟ اور اسکی  
 صفت کیا تھی؟

حضرت الاستاذ نے اسکے بعد حافظ ابن قیم کی تفسیر کی روشنی میں ذومرتبة فاستق کے مطلب کی  
 تشریح کی ہے جس کا یہاں ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔ پھر فتدلی کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:-

جیسا کہ قاضی بیضاوی نے ذکر کیا ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اس حالت  
 میں جبریل اپنے مکان سے متجاوز نہیں ہوتے تھے کیونکہ تدلی کے معنی ہیں ستر سال متعلق  
 جیسے پھل کے ٹک آنے کو تدلی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جبریل امین کی تدلی کی مثال اس  
 روشنی کی مانند ہے جو فضا میں پھیلی ہوئی ہو اور کسی روشن دان میں سے ہو کر بھی گزر رہی ہو،  
 اس کو دیکھنے والا اپنے گھر میں دیکھتا ہے مگر کبھی بھی وہ جانتا ہو کہ روشنی اپنے موضع سے  
 منفصل نہیں ہے۔ تدلی کے لفظ سے جب یہ معنی مراد لئے جائیں تو اس سے اسپرہی  
 روشنی پڑتی ہے کہ حضرت جبریل کس طرح بصورت بشر آتے تھے اسکے بعد فرمایا گیا "فاوحی  
 الی عبدہ ما اوحی" اس میں ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے جبریل کی طرف نہیں، امام  
 طبری کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں "فاوحی اللہ الی ما اوحی" یہی معنی امام مسلم کے  
 نزدیک مراد ہیں۔ اور امام بخاری نے شریک بن ابی نمر سے جو روایت نقل کی ہے اس  
 سے بھی یہی معنی مستفاد ہوتے ہیں امام احمد (مسند صفحہ ۱۴۹) نے ثابت عن انس کے طریق

سے جو روایت کی ہے اس سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔ ان سب روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت ”فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی“ واقعہ معراج (لیلۃ الاسراء) سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں ان روایات کی مراجعت کرنی چاہیے جو ابن کثیر (ص ۳۲۵) میں بہ طریق بن ابی الکھتلمہ اور مسند احمد ص ۴۰۳ میں امام احمد سے منقول ہیں۔ پوچھا جاسکتا ہے کہ اس صورت میں جبکہ ”اوحی الی عبدہ ما اوحی“ میں اوحی کا فاعل جبریل کے بجائے خدا کو بنایا جائے۔ انتشارِ ضمائر اور انفکاک فی نظم لازم آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شبہ بے بنیاد اور نادرست ہے کیونکہ ایجا کا وصف اللہ تعالیٰ میں منحصر ہے اور سورۃ النجم کی ان آیات میں دو کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک موجی اور دوسرا معلم اس بنا پر اوحی کی ضمیر مرفوع مستتر خدا کی طرف ہی راجع ہونی چاہیے ابتداءً ضمائر معنی میں التباس و اشتباہ کا سبب ہوتا ہے اس بنا پر وہ ناجائز ہے لیکن یہاں معنی میں اشتباہ کا امکان ہی نہیں۔

علاوہ ازیں ایک بات یہ بھی ہے کہ ان آیتوں میں عطف واو کے ذریعہ سے نہیں کیا گیا ہے بلکہ وہ ایک مرتب سلسلہ ہے جس میں بعض چیزیں بعض چیزوں پر خارج میں مرتب ہوتی چلی گئی ہیں اور ان سب کی انتہا اللہ پر ہوتی ہے اس اعتبار سے ”فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی“ اس مضمون کے لئے بہ طور خلاصہ ہے جو ”اِنْ هُوَ اِلَّا وَّحٰیُّ یُوحٰی“ میں بیان کیا گیا ہے۔ اب پھر اسی مضمون کو بیان کیا جا رہا ہے جیسا کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہُمْ سَمْرٌ مِّنْ قَبْلِہِمْ لَعَلَّہُمْ یَهْتَدُونَ۔

اس کے بعد فرمایا گیا ”مَا كَذَّبَ الْفُؤَادُ مَا رَأٰی“ اس کو ماقبل سے منفصل لایا گیا اور عطف نہیں کیا گیا۔ کیونکہ یہ دل سے اللہ کی رویت اور جبریل امین کی انکی مٹنی شکل میں

رویت کے مضمون پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں روایتیں معراج سے پہلے کی ہیں پھر مآراہی  
میں اللہ اور جسبریل کی رویت کے علاوہ وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو آپ نے  
شب معراج میں دیکھیں۔ چنانچہ آگے چل کر فرمایا گیا ہے۔

لَقَدْ رَأَى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ

آنحضرتؐ نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں

سورہ بنی اسرائیل میں ذکر ہے۔

لِنُرِيَهُمْ مِنْ آيَاتِنَا

تاکہ ہم آپ کو اپنی آیات دکھائیں۔

پھر اسی مقام پر ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي آرَيْنَاكَ

اور جو روایا ہم نے آپ کو دکھایا ہے ہم نے

إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ

اس کو لوگوں کیلئے آزمائش کی چیز بنایا ہے

اس آیت میں جو فتنہ ہے یہ وہی مہاراة (جھگڑنا) ہے جس پر آفتما روتہما علیٰ

مَا يَدْرِي فَمَا كَرَّمَاتُ كَرْنِ وَالْوَلُونَ كَوْزَجْرُو تُوخِ كِ كُنَى هِے۔

اس تقریر سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ مَا كَذَّبَ الْفِرَادُ مَا رَأَىٰ کی تقدیر عبارت

یوں ہے مَا كَذَّبَ الْفِرَادُ عَبْدًا نَا مَا رَأَىٰ اس راہی کا فاعل عبد یعنی آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم ہیں اور یہ رویت عام ہے خواہ دل کے ذریعہ سے ہو یا آنکھ کے ذریعہ۔ اس صورت میں کذب

متعدی بد و مفعول ہوگا اور اس میں کوئی دشواری نہیں کیونکہ تکذیب کی طرح کذب بھی متعدی

بد و مفعول ہو کر آتا ہے مثلاً یوں کہیں صَدَقْتَ فَلَانًا لِحَدِيثِ كَذِبْتُمْ اور یہ بھی ہو سکتا

ہے کہ اس کو ایک مفعول پر ہی مقتصر مانا جائے۔ جیسا کہ امام نووی نے فراء سے نقل کیا ہے

اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ دل نے اس معاملہ میں جھوٹ نہیں کہا بلکہ اس نے وہی کہا

جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں عیاناً دیکھا۔

آگے چلے ارشاد ہوتا ہے "وَلَقَدْ رَاٰ نَزْلَةَ اٰخِرٰی" اس میں اگر ذی کا فاعل آنحضرتؐ کو نہیں بلکہ فواد کو بنایا جائے تو یہ زیادہ واضح بات ہوگی اور اب اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ قلب نے جو کچھ دیکھا تھا اس کو من وعن بیان کر دیا اور اس میں جھوٹ نہیں کہا یہاں روایت سے مراد روایت فواد ہوگی اور بعد میں جو روایت بصر کا ذکر ہو تو واضح رہنا چاہئے کہ ان دونوں میں کوئی تضاد اور تعارض نہیں ہے کیونکہ روایت امر واحد ہے خواہ دل سے ہو یا آنکھ سے فرق صرف فاعل کا ہے اس لئے عبارت میں انفکاک اور نظم میں انتشار پیدا نہیں ہوتا۔

مرفورہ احادیث اور صحیح آثار سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی روایت دو مرتبہ ہوئی ہے ایک مرتبہ دل سے اور دوسری مرتبہ آنکھ سے مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی کے بعد جو اَفْتَمَارُ وَنَهْ عَلٰی مَا يَرٰی ہے اس میں بجائے صیغہ ماضی کے یرى بصیغہ مضارع فرمانا بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ روایت اولیٰ کے علاوہ کوئی اور روایت ہے حضرت ابن عباس کا ایک اثر ہے اس سے بھی اس کی ہی تائید ہوتی ہے آپ فرماتے ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ آنکھ سے اور دوسری مرتبہ دل سے علامہ طبرانی نے اس اثر کو اوسط میں نقل کیا ہے اور سوائے جہور بن منصور الکوفی کے اسکے تمام راوی صحیح کے رواۃ ہیں جہور بن منصور کو بھی ابن حبان نے ثقاہ میں شمار کیا ہے اس کے بعد فرماتے ہیں "وَلَقَدْ رَاٰ نَزْلَةَ اٰخِرٰی" میں جو روایت ہے وہ خدا اور جبریل دونوں سے متعلق ہے جبریل امین کی روایت تو ظاہر ہے اللہ کی روایت ماننے کی صورت میں یہ کہنا پڑے گا کہ جس طرح بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ خدایات کے ثلث آخر میں سارا دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے اسی طرح اس آیت میں بھی نَزْلَةَ اٰخِرٰی کے معنی نزول الہی کے ہو سکتے ہیں اب رہا عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی تو یہ واضح رہنا چاہئے کہ ظرف یعنی عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی مریٰ کے ساتھ متعلق نہیں بلکہ روایت کیساتھ ہے جیسے کہتے ہیں رَاٰی الْهَلَالَ عِنْدَ الْمَسْجِدِ اس تقریر کی بنا پر

عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَى آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کو متعین کرتا ہونہ کہ جبریل یا خدا کے مقام کو  
 حضرت الاتاذ کی یہ تقریر نہایت مفصل ہے اور آپ نے اس میں عجیب و غریب نکات و  
 لطائف مستند حوالوں کی روشنی میں بیان کئے ہیں۔ ہم نے مذکورہ بالا انتخاب میں جستہ جستہ وہی  
 فقرے نقل کئے ہیں جو ہمارے موضوع بحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس تقریر سے یہ بات ثابت  
 ہو جاتی ہے کہ سورہ النجم کی آیات مجوٹ عنہا صرف واقعہ معراج سے متعلق ہیں اور ان میں لیلۃ الالاء  
 کے ہی احوال و کیفیات کو نہایت پلین پیرا میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ وحی اس واقعہ کی ابتدائی  
 منزل ہے اس لئے شروع میں وحی کی صفت اور اس کی کیفیت و امکان پر روشنی ڈالی گئی ہے  
 آیات النجم کی مذکورہ بالا تفسیر کے مطابق حضرت جبریل کی ان کی اصلی شکل میں رویت ایک تو  
 وہ ہے جو معراج میں ہوئی۔ اب رہی دوسری رویت جس کا ذکر حضرت عائشہ نے کیا ہے تو اس کی نسبت  
 مختلف روایتیں ہیں حضرت عائشہ کی ہی ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسری رویت کا واقعہ  
 ایک مقام پر جس کا نام اجیاد ہے پیش آیا تھا۔ بعض روایتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غار حرا میں آپ پر جب  
 پہلی وحی اُقرأَ بِاسْمِ رَبِّكَ نازل ہوئی تو اس دفعہ جبریل اپنی اصلی شکل میں ہی تشریف لائے تھے  
 ہمارے نزدیک یہی صحیح ہے اور بخاری کی احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ہم ذیل میں پوری  
 حدیث نقل کرتے ہیں تاکہ اس خاص مسئلہ کے علاوہ وحی کی بعض اور کیفیات پر بھی روشنی پڑ جائے۔

”حضرت عائشہ ام المومنین سے روایت ہے کہ سب سے پہلی وحی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
 پر نازل ہوئی وہ خواب میں بہ صورت رویائے صالحہ تھی آنحضرت جو خواب دیکھتے تھے وہ صبح کے روشن  
 اجالے کی طرح سچ نکلتا تھا۔ پھر آپ کو تنہائی محبوب ہو گئی غار حرا میں جا کر آپ تنہا کچھ دن بسر کرتے  
 تھے اور گھر آنے سے پہلے کسی کسی شب عبادت میں مصروف رہتے تھے کھانے پینے کی چیزیں بھی ساتھ

لے جاتے تھے جب وہ سامان ختم ہو جاتا تو گھر واپس آتے اور پھر نیا سامان لے کر غار میں تشریف لے جاتے۔ یہاں تک کہ غار میں ہی حق آپ کے سامنے آیا اور وہ فرشتہ آپ کے پاس پہنچا اور آپ نے کہا: "پڑھ" آپ نے فرمایا: "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" حضور فرماتے ہیں اب اس فرشتہ نے مجھ کو پکڑ لیا اتنا دبا یا کہ میں تھک گیا۔ پھر اس نے مجھ کو چھوڑ دیا اور کہا: "پڑھ" میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں اب اس فرشتہ نے مجھ کو پکڑ لیا اور پھر دبا یا یہاں تک کہ میں تھک گیا۔ پھر اس نے مجھ کو چھوڑ دیا اور کہا: "پڑھ" میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" فرشتہ نے تیسری مرتبہ پھر مجھ کو پکڑا۔ دبا یا اور چھوڑ دیا اور کہا۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ  
خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَأْ  
وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ  
عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ  
يَعْلَمْ

پڑھا اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا ہے پڑھا اور تیرا پروردگار بڑا بزرگ ہے جس نے قلم کے ذریعہ سکھایا اور انسان کو وہ کچھ سکھایا ہے جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان آیتوں کے ساتھ گھر واپس آئے قلب مبارک لرز رہا تھا۔ حضرت خدیجہ بنت خویلد کے پاس آئے اور فرمایا: "مجھ کو کب اڑھا دو" مجھ کو کب اڑھا دو" لوگوں نے آپ کو کب اڑھا دیا یہاں تک کہ دہشت کی وہ حالت جاتی رہی۔ پھر آپ نے حضرت خدیجہ سے سارا ماجرا بیان کیا اور فرمایا کہ مجھ کو اپنی جان کا خطرہ ہے۔ حضرت خدیجہ بولیں ہرگز نہیں خدا آپ کو کبھی روبا نہیں کرے گا آپ قرابت داروں سے صلہ رحمی کا بڑا ذکر کرتے ہیں۔ لوگوں کا بوجھ خود اٹھاتے ہیں۔ اپنا بچوں اور محتاجوں کے لئے کمائی کرتے ہیں۔ بہانوں کی بہانداری کرتے ہیں مصائب و حوادث میں آپ حق کی امداد و اعانت کرتے ہیں پھر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لیکر ورقہ بن نوفل کے پاس آئیں

جو حضرت خدیجہ کے چچا زاد بھائی تھے اور جنہوں نے عہد جاہلیت میں عیسائی مذہب قبول کیا تھا۔  
یہ انجیل کو عبرانی میں لکھتے تھے جتنا بھی لکھ سکتے تھے، بڑھے بہت تھے بصارت  
جاتی رہی تھی۔ حضرت خدیجہ نے ان سے کہا "بھائی ذرا اپنے بھتیجے کی سنو" ورقہ بولے "بھتیجے! تباؤ تم  
کیا دیکھتے ہو؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا کہہ سنایا، ورقہ بولے "یہ وہی ناموس (حرم سہرا) ہے جسکو اللہ  
نے موسیٰ پر نازل کیا تھا۔ اے کاش میں اس وقت جوان ہوتا اے کاش میں اس وقت زندہ ہوتا،  
جب کہ تمہاری قوم تم کو نکال دیگی" آنحضرت نے پوچھا "کیا میری قوم مجھ کو نکال دیگی؟" انہوں نے  
جواب دیا "ہاں جو چیز تم لے کر آئے ہو وہ ایسی چیز ہے کہ جو کوئی اس کو لے کر آیا اس کے ساتھ دشمنی کی  
گئی اور اگر میں اس روز تک زندہ رہا تو میں تمہاری مدد کروں گا۔ نہایت قوی اور مضبوط مدد۔ اس  
واقعہ کو پیش آئے چند روز ہی ہوئے تھے کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا۔"

اس واقعہ میں اگرچہ اس کا ذکر نہیں ہے کہ فرشتہ وحی اصلی شکل میں نازل ہوا تھا یا کسی  
انسانی صورت میں آیا تھا لیکن حضور کا جبریل کو فرشتہ کہنا، ان کی آمد سے خوف زدہ ہو جانا اور جبریل  
کے دبلنے سے آپ کا تعب زدہ ہو جانا یہ سب اس امر کے قرائن ہیں کہ فرشتہ وحی کا نزول اپنی اصلی  
شکل میں ہوا تھا، ساتھ ہی اس پر غور کرو کہ حضور کا اس واقعہ سے غیر معمولی طور پر متاثر ہونا اور پھر ورقہ  
کا تسلی و تشفی کرنا اس طرح صاف صاف بتا رہا ہے کہ حضور کو جو وحی الہی پہنچی آپ پہلے سے اس سے باخبر  
نہیں تھے اور یہ جو کچھ ہوا محض خدا کے حکم سے اور آپ کے اپنے ارادہ کے بغیر ہوا۔ کیا سید کو نبی  
کے پیغمبر ہونے اور آپ کے پیغام کے وحی الہی ہونے کی کوئی نفسیاتی دلیل اس سے بڑھ کر ہو سکتی ہے؟

لہذا اس واقعہ میں ورقہ بن نوفل نے جو کچھ کہا ہے اور جبریل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی ہے اس کے پیش نظر  
تمام علماء اسلام کا اتفاق ہے کہ وہ مؤمن تھے یہاں تک کہ بعضوں نے تو ان کو صحابہ میں بھی شمار کیا ہے البتہ اس میں تردد  
ہے کہ آیا وہ اس امت میں بھی شمار ہو سکتے ہیں یا نہیں وجہ یہ ہے کہ دعوت اسلام کے لہور سے پہلے انکی وفات ہو گئی تھی

چٹا طریقہ وحی | ایک طریقہ وحی یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی فرشتہ یا آواز کے توسط کے براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر وحی نازل فرماتے جیسا کہ لیلۃ المعراج میں پانچ نمازوں کو فرض کیا گیا۔

ساتواں طریقہ وحی | ایک طریقہ وحی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی فرشتہ کی وساطت کے بغیر کلام کرے جیسا کہ از روئے نص قرآن حضرت موسیٰ کے لئے ثابت ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی معراج میں ثابت ہے۔

حافظ ابن قیم وحی کے یہ سات طریقے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ بعض علمائے ان طریقوں پر ایک اور طریقہ کا اضافہ کیا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ پس پردہ و حجاب نہیں بلکہ تمام حجابوں کو اٹھا کر نظروں کے سامنے جلوہ نما ہوا اور شرف خطاب و کلام عطا فرمائے علامہ فرماتے ہیں کہ یہ طریقہ وحی ان لوگوں کے نزدیک تو مستحق ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ سید اولاد آدم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم مبارک دیدار الہی سے شاد کام و فائز المرام ہوئی تھی، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ مسئلہ علماء سلف و خلف میں مختلف فیہ رہا ہے (روایتیں دونوں قسم کی ہیں) اگرچہ اس بارہ میں جمہور صحابہ بلکہ سب کے سب ہی حضرت عائشہ کے ساتھ ہیں۔ مباحکاء عثمان بن سعید لداری

آنحضرت اور مسئلہ رویت باری کی تہتق | سورہ النجم میں جو آیات وحی سے متعلق ہیں چونکہ ان میں رویت باری کا بھی ذکر آیا ہے۔ اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقع پر اس مسئلہ کو کسی قدر تفصیل سے بیان کر دیا جائے جیسا کہ علامہ ابن قیم نے فرمایا ہے یہ مسئلہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج میں باری تعالیٰ کی رویت بصری ہوئی تھی یا نہیں، علماء سلف و خلف میں مختلف رہا ہے اور وجہ اختلاف یہ ہے کہ آثار و روایات، مثبت و منفی دونوں طرح کی ہیں یہ صحیح ہے کہ حضرت عائشہ کا مسلک اس باب میں یہی تھا



کہ وہ روایت کی نفی کرتی تھیں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت مسروق سے روایت ہے کہ میں حضرت عائشہ کے پاس ٹیک لگائے بیٹھا تھا کلام المؤمنین نے فرمایا "ابوعائشہ تین باتیں ایسی ہیں جن میں سے اگر کسی ایک کا بھی کوئی شخص قائل ہو تو اس نے خدا پر بڑا بہتان باندھا" میں نے پوچھا "وہ کیا باتیں ہیں ارشاد ہوا جس شخص نے یہ کہا کہ محمد نے خدا کو دیکھا اس نے خدا پر بڑی تہمت لگائی" مسروق کہتے ہیں "میں تکیہ لگائے بیٹھا تھا یہ سن کر اٹھ بیٹھا اور عرض کیا "اے ام المؤمنین آپ ذرا مجھ کو مہلت دیجئے اور جلدی نہ کیجئے کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں منرایا۔"

وَلَقَدْ رَاكُمْ بِالْأَفْقِ الْمُبِينِ  
وَلَقَدْ رَاكُمْ نَزَلَتْ آخَرَىٰ

اور آپ نے اس کو افقِ مبین پر دیکھا اور  
آپ نے اس کو دوبارہ اترتے ہوئے دیکھا

حضرت عائشہ نے جواب دیا "سب سے پہلے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی نسبت سوال کیا تھا تو آپ نے فرمایا کہ اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں جن کو میں نے ان دو مرتبوں کے علاوہ ان کی اصلی شکل میں کبھی نہیں دیکھا، میں نے ان کو آسمان سے اترتے ہوئے اس طرح دیکھا کہ انھوں نے زمین و آسمان کے درمیان کی تمام فضا کو گھیر لیا تھا" اس کے بعد ام المؤمنین نے فرمایا "کیا تم نے نہیں سنا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔"

لَا تَدْرِيكَ إِلَّا بَصَارٌ وَهُوَ يَدْرِيكَ  
الْأَبْصَارُ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ

نگاہیں اس کو نہیں پاسکتی اور وہ نگاہوں کو  
پالتا ہے اور وہ لطیف و خبیر ہے۔

کیا تم نے نہیں سنا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ  
إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ  
أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا

کسی بشر کی مجال نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے  
کلام کرے مگر وحی کے ذریعے یا پس پردہ یا اس  
طرح کہ وہ رسول کو بھیجے۔

اس کے برخلاف بعض روایتوں سے اس سوال کا جواب اثبات میں ملتا ہے۔ صحیح بخاری

میں حضرت انس سے شریک بن عبداللہ نے جو روایت کی ہے اس کے آخر میں ہے۔

حَتَّىٰ جَاءَ سِدْرَةَ الْمُنْتَهَىٰ وَدَنَا

یہاں تک کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے

الْجَبَّارُ رَبُّ الْعَزَّةِ فَتَدَلَّى

تو عزت والا جبار خدا قریب آیا یہاں تک

حَتَّىٰ كَانَ مِنْهَا قَابَ قَوْسَيْنِ

آپ کے اور خدا کے درمیان دو کمانوں یا

أَوَادِنِي (کتاب التوحید) اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا۔

صحابہ میں جو حضرات روایت کا ثبوت مانتے تھے ان میں حضرت عبداللہ بن عباس کو خاص

امتیاز ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے حضرت عکرمہ کی موجودگی میں فرمایا "رَأَى مُحَمَّدًا رَبَّنَا" محمد

صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے۔ عکرمہ بولے کہ اللہ کا ارشاد نہیں ہے "لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ

وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ" فرمایا "ہاں سچ ہے لیکن اس وقت جب کہ خدا اپنے اصلی نور میں جلوہ

فروز ہو" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دو مرتبہ دیکھا ہے (ترمذی باب تفسیر سورۃ النجم) ترمذی

میں ابوسلمہ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے آیت "وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ"

کی تلاوت کرنے کے بعد فرمایا "وَقَدْ رَآهُ الْاَبْنَىٰ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ"

صحیح مسلم و ترمذی میں حضرت ابوذر غفاری سے روایت ہے کہ انھوں نے آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یا رسول اللہ آپ نے خدا کو بھی دیکھا ہے؟ فرمایا وہ تو نور ہے

میں اسے کہاں دیکھ سکتا ہوں؟ اس روایت سے بہ بظاہر روایت کی نفی کا مضمون ظاہر ہوتا ہے

لیکن حضرت عبداللہ بن عباس کے الفاظ میں اس کا جواب بھی دیا جاسکتا ہے کہ آپ کا یہ فرمانا کہ میں

اس کو کہاں دیکھ سکتا ہوں؟ اس وقت کے لئے مخصوص ہے جب کہ خدا اپنے اصلی نور میں جلوہ فروز

ہو۔ چنانچہ صحیح مسلم (ج ۱ باب الاسراء) اور ترمذی (تفسیر سورۃ النجم) میں ایک روایت ہے جس میں آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میں نے صرف ایک نور دیکھا تھا۔ گویا حضرت عائشہؓ جس آیت سے روایت باری کے عدم امکان پر استدلال کرتی ہیں یعنی لَا تَدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ تو حضرت ابن عباسؓ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ لَا تَدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ کے معنی یہ ہیں کہ نگاہیں حضرت باری عز اسمہ کا احاطہ نہیں کر سکتی اور وہ اس ذات بے ہمتا و بے مثال کو اس طرح نہیں دیکھتیں جس طرح کہ وہ کسی شے کو دیکھ لیتی ہیں اس بنا پر حضور پر نور کا نورِ آشیٰ آرا کا فرمانا بھی اسی مراد پر محمول کرنا چاہیے۔

پھر وہ حضرت جو ثبوت روایت کے قائل ہیں ان کا ایک استدلال یہ بھی ہے کہ قرآن مجید کی نص  
 وَجُودًا يَوْمَئِذٍ نَّاصِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا  
 اس دن چہرے تروتازہ ہوں گے اور اپنے  
 رب کو دیکھ رہے ہوں گے۔  
 نَاظِرَاتٌ

اور دوسری آیات و احادیث کے مطابق اہل سنت و الجماعت کے نزدیک آنا تو مسلم ہے ہی کہ آخرت میں اہل جنت کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ پس جب آخرت میں عام اہل جنت دیدار الہی کی نعمت و دولت سے شرف اندوز ہو سکتے ہیں تو اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں یہ امتیاز حاصل ہو گیا ہو تو اس میں استبعاد کی کیا بات ہے۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس نزاع کو دور کرنے کی ایک صورت یہ تجویز کی ہے کہ حضرت ابن عباس سے اس معاملہ میں جو روایات منقول ہیں وہ درج کی ہیں ایک مطلق اور دوسری متشدد مطلق تو وہ ہی روایات ہیں جو اوپر گزر چکی ہیں اور جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مطلق دیدار الہی کا خواہ چشم ظاہر کے ذریعہ ہو یا چشم قلب سے ذکر ہے ان روایات کے ساتھ ہی بعض روایات میں جن میں مطلق نہیں بلکہ مقید روایت کا ذکر ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ابو العالیہ کی سند سے مذکور ہے کہ حضرت ابن عباس نے مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ وَلَقَدْ رَآهُ نَزَلَةً أُخْرَىٰ کی تفسیر میں فرمایا۔

رَأَى رَبَّهُ بِفَوَادِهِ مَرَّتَيْنِ  
آنحضرت نے اپنے رب کو چشمِ قلب سے دو مرتبہ دیکھا  
حضرت عطا کی سند سے ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا۔

رَأَاهُ بِقَلْبِهِ  
آنحضرت نے خدا کو اپنے قلب کی آنکھ سے دیکھا تھا  
ابن مردویہ نے اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ یہ طریق عطا نقل کیا ہے۔

لَمْ يَرَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو آنکھ سے نہیں  
وَسَلَّمَ بَعْدَيْهِ إِنَّمَا رَأَاهُ بِقَلْبِهِ  
دیکھا بلکہ دل سے دیکھا تھا۔

پس حضرت ابن عباس کی جن روایتوں میں مطلق رویت کا ذکر ہے اور چشم یا قلب کسی کی تصریح نہیں ہے۔ اگر مقید روایات کے پیش نظر ان کو بھی رویت بالفواد پر محمول کر لیا جائے اور ساتھ ہی حضرت عائشہ کی روایات میں جو رویت کی نفی ہے۔ اس کو رویت بالعين پر محمول کر لیا جائے تو ایک نئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ ثبوت رویت جس اعتبار سے ہے اس اعتبار سے نفی رویت نہیں اور حضرت عائشہ جس رویت کی نفی کرتی ہیں یعنی رویت بالبصر حضرت ابن عباس اس کے قائل نہیں۔ ظاہر ہے کہ جہاں تک روایات و آثار کا تعلق ہے۔ حافظ ابن حجر کی اس تقریر سے حضرت ابن عباس اور ام المومنین حضرت عائشہ کے اس نزاع کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ تکرار مجید سے تو رویت بصری کا پتہ چلتا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى  
تو تبنیائی نہیں نہ تو کجی پیدا ہوئی اور نہ اس  
نے سرکشی کی۔

ہماری رائے میں اس موقع پر حضرت الاتاذ مولانا السید محمد انور شاہ الکنشیری نے جو تقریر کی ہے وہ اس مشکل کا بہترین حل ہے ہم اسے مختصر اذیل میں نقل کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

”آحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یقیناً رویت ہوئی تھی۔ لیکن بات یہ ہے کہ رویت ایک طرح کی ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں نوعیتوں کے اس اختلاف کی وجہ سے ایک طرح کی رویت کا ثبوت دوسری نوع کی رویت کی نفی ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک دوست اپنے دوست کو دیکھتا ہے۔ ایک خادم اپنے مخدوم کو دیکھتا ہے۔ ایک ادنیٰ درجہ کا آدمی ایک جلیل القدر بادشاہ کی دید کرتا ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ ان سب مثالوں میں ایک رویت دوسری رویت سے بالکل مختلف طریقہ پر پائی جا رہی ہے۔ پس اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ معراج میں آحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت باری عز اسمہ کی جو دید ہوئی تھی وہ ایک خاص طرح کی دید تھی جس کو ہم دنیا کی کسی دید پر بھی قیاس نہیں کر سکتے۔ اس بنا پر ہمارا دید کا اثبات اور نفی دونوں صحیح ہوں گے۔ اثبات ایک خاص دید کے لحاظ سے ہے اور نفی دنیوی دید کے اعتبار سے۔ اب یہ کہا جاسکتا ہے کہ اثبات و نفی رویت میں تنافی اور تضاد نہیں ہے بلکہ دونوں مراد کی ایک ایک طرف کو ظاہر کرتے ہیں۔“

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں ”آحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت باری کو اگر تمثیلاً بیان کیا جاسکتا ہے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی چشم اشتیاق و تمنانے ذات احدیت کے جمال بے مثال کا نظارہ اس طرح کیا کہ جس طرح ایک عاشق اپنے محبوب کا یا ایک باادب نوکر اپنے آقا کا کرتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں دیکھنے والا اپنی نگاہ کو روک بھی نہیں سکتا اور ساتھ ہی اس کی مجال یہ بھی نہیں ہوتی کہ وہ آنکھیں جا کر مشاہدہ کرے قرآن مجید میں اس رویت کے سلسلہ میں جو مَازَاغُ الْبَصَرِ وَمَا طَغَىٰ فرمایا گیا ہے تو اس میں رویت کی اس خاص کیفیت دونوں کی ہی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ چنانچہ ”مَازَاغُ“ کا مطلب یہ ہے کہ چشم محمدی نے جمال الہی کے دیکھنے میں تغافل و شامح کو بالکل روا نہیں رکھا۔ پھر ”مَا طَغَىٰ“ سے مراد یہ ہے کہ باوجود کمال

اشتیاق کے چشمِ محمدی کیلئے یہ ناممکن تھا کہ وہ دائرہ ادب سے باہر قدم رکھے۔  
یعنی اپنی نگاہیں جمالِ ربانی پر جاوے کسی عربی شاعر نے کہا ہے۔

أَشْتَاقُهُ فَإِذَا بَدَأَ      أَطْرَقَتْ مِنْ إِجْلَالِهِ

ترجمہ :- میں اس کا مشتاق دیدہ ہوں، لیکن جب وہ ظاہر ہوتا ہے تو میں اس کی جلالتِ شان

کی وجہ سے سُرنگوں ہو جاتا ہوں

—\*—

# قرآن اور وحی

چونکہ تمام اعتقادات اور ایمان و عمل کا دار و مدار اس یقین پر ہے کہ سنجیر کی زبان حق ترجمان سے جو کچھ ادا ہو رہا ہے وہ مخالف اللہ ہے اور جن احکام کے اتباع کا حکم دیا جا رہا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے ہی ارشاد فرمائے ہوئے ہیں اس لئے ہر آسمانی مذہب کا فرض ہے کہ وہ اپنے احکام کی تعلیم و تلقین سے پہلے لوگوں کو اپنے آسمانی ہونے کا یقین دلائے اور اسلام چونکہ دنیا کا آخری اور سب سے زیادہ کامل و مکمل مذہب ہے اور اس کی دعوت کسی خاص ملک و قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے۔ اس بنا پر تمام سماوی ادیان و مذاہب میں یہ امتیازِ خصوصی صرف قرآن مجید کو حاصل ہے کہ جس تکرار و تاکید سے اس نے اپنا منزل من اللہ ہونا بیان کیا ہے کسی اور کتاب نے اپنی نسبت اس شد و بد اور تاکید و تکرار سے نہیں کیا۔ قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر توحیدی جو لوگ اس کے منزل من اللہ ہونے پر شک کرتے ہیں ان کو توحیدی کی گئی۔ ارشاد ہے۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَيَّ  
عَبْدِنَا فَاتْلُوا سُوْرَةَ مِّنْ مِّثْلِهِ  
وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِمَّنْ دُونِ  
اللَّهِ إِنَّ كُنْتُمْ صَادِقِينَ

اور اگر تم کو کچھ شبہ ہو اس چیز کے متعلق جو ہم  
نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو اس صیسی  
کوئی سورۃ لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے  
گو ایوں کو بلاؤ اگر تم سچے ہو۔

پھر اس پر ہی بس نہیں بلکہ سخت تہدید کے انداز میں منسرایا جاتا ہے۔

فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا  
النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْجِبَارُ  
أَعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ  
(بقرہ)

اور اگر تم ایسا نہ کرو (یعنی قرآن کی کسی سورت  
کا مثل نہ لاؤ) اور تم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے تو ڈرو  
اس آگ سے جس کا ایندھن لوگ اور پتھر  
ہوں گے جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔

ایک مقام پر ہے۔

قُلْ لَنْ أَجْمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ  
عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ  
لَآ يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ  
لِبَعْضٍ ظَهِيرًا (بنی اسرائیل)

(اے نبی) آپ کہہ دیجئے کہ اگر انسان اور جن  
اس قرآن کا مثل لانے پر متفق ہو جائیں تب  
بھی وہ اس کا مثل نہیں لاسکیں گے، اگرچہ  
وہ ایک دوسرے کے مددگار ہو جائیں۔

ایک جگہ قرآن مجید کو منزل من اللہ نہ ماننے والوں کو جو اسے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کا کلام کہتے تھے اس طرح تحدی کی گئی ہے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَاتَّقُوا  
بِسُورَةِ مَن مِّثْلِهِ وَاذْعُوا مَنِ  
اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ  
كُنْتُمْ صَادِقِينَ (یونس)

کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے (نبی نے) خود اسے  
گھڑ لیا ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ اچھا اگر ایسا  
ہے تو تم اس جیسی ایک سورۃ تو لے آؤ اور اس  
کے سوا جن کو تم بلا سکتے ہو بلا لو اگر تم سچے ہو۔

یہ لوگ جو قرآن مجید کو اللہ کا کلام نہیں مانتے ان کی نسبت فرمایا گیا کہ یہ محض اپنی کوتاہ علمی  
اور ناواقفیت کے باعث ایسا کہتے ہیں اور اس امر کی نسبت جھوٹ بولتے ہیں جسے یہ خود  
نہیں جانتے۔ آیت بالا کے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے۔

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا

بلکہ انھوں نے ایسی چیز کی تکذیب کی جو جس کے



يَا تَهْمِرُونَ نِيلَهُ كَذَابٌ كَذِبٌ  
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانظُرْ كَيْفَ  
كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ (پس،  
علم کا احاطہ انہوں نے نہیں کیا اور جس کی اصل حقیقت  
ان کے سامنے نہیں آئی اسی طرح ان لوگوں  
سے پہلے بھی لوگوں نے تکذیب کی ہے پس  
آپ دیکھئے کہ ظالموں کا انجام کیا ہوا۔

ایک جگہ سرا یا گیا ہے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأَنزِلِ الْعَشْرَ  
سُورٍ مِثْلَهُ مَفْتَرِيَةٍ وَاذْعُوا مَنْ  
اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ  
نُنَزَّلُ صَادِقِينَ فَإِنْ لَمْ يَسْتَجِيبُوا  
لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَنْزَلَ اللَّهُ  
أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَهَلْ أَنْتُمْ  
مُسْلِمُونَ (ہود)

کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے خود قرآن گھڑ لیا  
ہے آپ کہہ دیجئے کہ اچھا اس طرح کی دس  
گھڑی ہوئی سورتیں ہی لے آؤ اور اللہ کے سوا  
جن لوگوں کو تم بلا سکو بلا لو اگر تم سچے ہو اور اگر  
وہ کچھ جواب نہ دیں تو جان لو کہ وہ اللہ کے علم سے  
آوارہ گیا ہو اور یہ کہ سوائے خدا کے کوئی دوسرا معبود  
نہیں ہے تو کیا تم اطاعت قبول کرنے والے ہو۔

اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان منکرین کی ہوا پرستی کا اس طرح یقین دلایا جاتا ہے۔

فَإِنْ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا  
يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ وَمَنْ أَضَلُّ  
مِمَّنْ اتَّبَعَ هَوَاهُ بَغَيْرِ هُدًى مِنَ  
اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ  
الظَّالِمِينَ (القصص)

(اے محمد) اگر وہ لوگ آپ کو جواب نہ دیں  
تو آپ جان لیں کہ یہ لوگ صرف اپنی خواہشوں  
کا اتباع کرتے ہیں اور ان لوگوں سے زیادہ گمراہ  
کون ہے جو اللہ کی ہدایت کے بغیر اپنی خواہشات  
کی پیروی کرتے ہوں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ ظالموں  
کو ہدایت نہیں دیتا۔

بعض جزئی واقعات سے قرآن مجید کے وحی ہونے پر استدلال

یہ آیات جو ادھر گزریں ان میں قرآنی عجاز کو پیش کر کے سخت ترین تحدی کی گئی ہے اور منکرین کے عجز سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مجید

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں، بلکہ اللہ کی طرف سے نازل کی ہوئی وحی ہے۔ ان آیات کے علاوہ بکثرت دوسری آیتیں بھی ہیں جن میں قرآن مجید کے وحی ہونے پر بعض جزئی واقعات اور قرآن مجید کے مضامین و مطالب سے استدلال کیا گیا ہے مثلاً

أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ بَلْ لَا يُؤْمِنُونَ  
فَلْيَأْتُوا بِالْحُجُجِ بَشْرًا مِّثْلِهِمْ أَمْ كَانُوا أَصَادِقِينَ (الطور)

یہ کہتے ہیں کہ (پیغمبر) قرآن مجید خود بنا لائے ہیں (کوئی نہیں)، بلکہ یہ لوگ ایمان نہیں لائے ہیں۔ اب ان کو چاہئے کہ کوئی بات اسی طرح کی لے آئیں اگر وہ سچے ہیں۔

حضرت یوسف کا واقعہ بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْٓنَا اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْتَمَعُوْا مِرْهُمُ وَهُمْ مُّكِيْمُوْنَ (يوسف)

یہ غیب کی خبریں جو ہم آپ پر وحی کرتے ہیں اور آپ (لئے محمد) ان کے پاس نہیں تھے جب انھوں نے اپنی کوشش مرکز کر لی اور وہ تدبیریں کرنے لگے۔

حضرت مریم کے واقعہ کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْٓنَا اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ لِيُقْضٰى اَلْحٰكَمُ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ (مریم)

یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کے پاس وحی کرتے ہیں اور آپ ان لوگوں کے پاس نہیں تھے جب وہ قلم اس غرض سے ڈال رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کرے گا اور آپ ان کے پاس نہیں تھے جبکہ وہ جگہ پر تھے

اس آیت کو ذرا غور سے پڑھئے اور دیکھئے کہ اس میں دو مرتبہ ”وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ“  
 فرما کر اس بات پر زور ڈالا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود حضرت مریم کی کفالت  
 پر بحث و تکرار کے وقت موجود نہیں تھے تو اب قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر آپ کو  
 اس واقعہ کا علم کس طرح ہوا؟ قرآن مجید اس کا جواب دیتا ہے کہ ”نُوحِيْٓرَ اِلَيْكَ“ ہم آپ پر اس  
 کی وحی بھیجتے ہیں یہ ظاہر ہے کہ کسی گذشتہ واقعہ کو معلوم کرنے کی دوہی صورتیں ہوتی ہیں، ایک  
 یہ کہ اُس کو کسی اخبار یا کتاب میں پڑھا ہو اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی سے سننے کا اتفاق  
 ہوا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان دونوں میں سے کوئی ایک صورت بھی متحقق نہیں  
 تھی پہلی صورت کی تو آپ نے خود ”لَسْتُ بِقَارِئٍ“ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں ”فرما کر نفی کر دی  
 اور آپ کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اس کی تردید نہیں کر سکا۔ اب رہی دوسری صورت، یعنی یہ کہ  
 آپ کو کسی نے یہ واقعات غیب نائے ہوں تو قرآن مجید اس کی تردید اس طرح کرتا ہے حضرت  
 نوح کے قصہ کے بعد ارشاد ہے۔

تِلْكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهَا	یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ
اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا اَنْتَ	پر وحی کرتے ہیں اس لئے پہلے نہ آپ اس کو
وَلَا قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا	جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم، آپ صبر کیجئے کوئی
فَاَصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ	شبہ نہیں کہ عاقبت پر پیرنگاروں کیلئے ہی ہے

پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ان دونوں میں سے کوئی ایک رلیو علم بھی نہیں ہے تو اب قرآن کا  
 دعویٰ ”نوحیٰ اِلَيْكَ“ کے تسلیم کرنے میں کیا مذہب ہو سکتا ہے؟ حضرت موسیٰ کے واقعہ کے سلسلہ میں آیا گیا کہ

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَا	اور اے نبی! آپ طور کی جانب غریب میں نہیں
اِلَى مُوسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنْ	تھے جب ہم نے موسیٰ کی طرف اپنا فیصلہ نازل

الشَّهِيدِينَ . (القصص) کیا اور آپ اس وقت وہاں موجود نہ تھے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا۔

وَلَكِنَّا أَنشَأْنَا قُرُونًا فَتَطَاوَلُ عَلَيْهِمُ  
الْعُصُرُ وَمَا كُنْتَ تَأْوِيًا فِي أَهْلِ  
مَدْيَنَ تَتْلُوا عَلَيْهِمْ آیَاتِنَا وَ  
لَكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ (القصص)

لیکن ہم نے بہت سی جماعتیں پیدا کیں اور  
ان پر دراز مدتیں گزر گئیں اور آپ مدین  
دالوں میں نہ رہتے تھے کہ ان کو ہماری  
آیات سناتے لیکن ہم رسول بھیجتے رہے ہیں

اس آیت کے بعد جو آیت ہے اس میں بھی اس مضمون کا اعادہ کیا گیا ہے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا  
وَلَكِن رَّحْمَةً مِّن رَّبِّكَ لِتُنذِرَ  
قَوْمًا مَّا أَتَّهُمْ مِّن نَّذِيرٍ مِّن  
قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ  
(القصص)

اور آپ طور کے کسی کنارہ پر نہیں تھے جب  
ہم نے ندادی، لیکن آپ کو یہ واقعہ محض اپنے  
رب کی رحمت سے معلوم ہوا ہے تاکہ آپ  
اس قوم کو ڈرائیں جس کے پاس آپ سے پہلے  
کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں

عرب کی گذشتہ قوموں کے حالات سنانے کے بعد ارشادِ حق بنیاد ہے۔

تِلْكَ الْقُرَىٰ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ  
أَنْبَاءِهَا

سورہ عنکبوت کی آیت ذیل میں اسی مضمون کو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس

انسانی ذرائعِ علم میں سے کوئی ذریعہ نہیں تھا اور آپ کا ذریعہ علم صرف وحی الہی تھا اور زیادہ  
واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ  
نَزُولِ قُرْآنٍ سِوَا مَا نَزَّلْنَا

نزل قرآن سے پہلے نہ تو آپ کوئی کتاب

وَلَا تَحْطَبُوا بِيَمِينِكُمْ إِذَا آذَنَ النَّبِيُّ  
الْمُبِطُونَ

پڑھتے تھے اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے  
لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو ان باطل پرستوں  
کے لئے شبہ کی گنجائش بھی نکلتی۔

اس آیت میں صراحتاً اس بات کا اعلان کر دیا گیا ہے کہ آپ نزولِ مسترآن سے  
پہلے نہ کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھ سکتے تھے۔

ایک مقام پر ارشاد ہے۔

وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا  
مِنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا  
الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ (شعراء)

اور اس طرح ہم نے آپ کے پاس اپنے  
حکم سے روح بھیجی۔ آپ جانتے ہی نہیں تھے  
کہ کتاب کیلئے اور ایمان کیا ہے۔

اب ایک احتمال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ یہ غیبی اطلاعات آپ نے کسی سے سنی  
ہوں تو اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مکہ معظمہ میں دو قسم کے لوگ آباد تھے ایک مشرکین  
اور دوسرے اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ مشرکین چونکہ کوئی کتاب نہیں رکھتے تھے اس لئے  
ان کو انبیاء متقدمین کا کوئی واقعہ بھی معلوم نہیں تھا، چنانچہ حضرت مریم کے قصہ میں "مَا كُنْتَ  
تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ" فرما کر اسی امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اب ہے مکہ کے اہل کتاب  
یہود و نصاریٰ تو اس میں شبہ نہیں کہ ان لوگوں کی آسمانی کتابوں میں بعض انبیاء کے واقعات  
کا تذکرہ ضرور ہے لیکن سید کونین کے بڑے سے بڑے دشمن بھی جانتے تھے کہ آپ نبوت سے  
پہلے ان لوگوں سے الگ تھلگ رہتے تھے اور اس لئے کوئی شخص ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال  
نہیں کر سکتا تھا کہ آپ کو ان غیبی قصص و واقعات کا علم یہود و نصاریٰ کے ذریعہ ہوا ہے۔ دشمنوں  
نے آپ کی تکذیب میں کیا کچھ کہا لیکن قرآن کے اداء: "نَقُصُّ عَلَيْكَ" "يَا أُوحِيْدُ إِلَيْكَ"

کے جواب میں یہ کہنے کی جسارت کسی ایک کو بھی نہیں ہوئی کہ آپ فلاں وقت یا فلاں مقام پر کسی عیسائی یا یہودی سے قصہ سن رہے تھے۔ لے دے کے عیسائیوں کے پاس بھیرا رہے گا ایک افسانہ ہے جو اول تو ثابت نہیں اور اگر ثابت مان بھی لیا جائے تو کیا دنیا کا کوئی معمول عقل کا انسان بھی اسے باور کر سکتا ہے کہ راہب نے چند منٹوں میں ہی آپ کو جب کہ آپ کی عمر بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہیں تھی اور آپ اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ شام کے سفر پر جا رہے تھے وہ سب کچھ بتا دیا جو قرآن مجید کے دو دفتوں کے درمیان ہے اور پھر آپ نے اس کو بغیر لکھے ہی من و عن گوشہ خاطر میں محفوظ کر لیا اور لطف یہ ہے کہ آپ شام سے واپس آتے ہیں اور اس کے بعد نبوت سے قبل تک، تالیس اٹھالیس سال مکہ میں رہتے ہیں اور قبیلہ کے لوگوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں اور اس کے باوجود راہب کے سناے ہوئے واقعات کو چہل سالگی کی عمر تک بالکل حرفِ راز کی طرح سینہ میں پوشیدہ رکھتے ہیں۔ اشارۃً و کنایتہً بھی کسی سے کسی واقعہ کا ذکر نہیں آتا اور چالیس سال کی عمر کے بعد یکا یک غیبی اطلاعات کا سمندر اُمنڈ پڑتا ہے۔ یا للعجب

بہر حال یہ احتمال چونکہ اس درجہ کمزور تھا کہ آپ کے دشمنوں کے حاشیہ خیال میں بھی موجود نہیں تھا اس لئے قرآن مجید نے اس سے سکوت کیا۔

عدم اختلاف سے قرآن کے | جزئی واقعات کے علاوہ قرآن مجید میں اختلاف کے نہ ہونے  
منزل من اللہ ہونے پر استدلال سے بھی اس کے منزل من اللہ ہونے پر استدلال کیا ہے۔ ارشاد ہے

أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ طَوْلُوا

کيا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے اور اگر

کَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا

یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ

فِيهَا اخْتِلاَفًا كَثِيرًا (نساء)

اس میں کثیر اختلاف پاتے۔

اہل کتاب سترن کے منزل | اہل کتاب اگرچہ زبان سے انکار کرتے تھے لیکن دل میں وہ  
من اللہ ہونے سے باخبر ہیں بھی جانتے تھے کہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے اور اس کی وجہ یہ  
ہے کہ یہ لوگ خود اہل کتاب تھے اور اس بنا پر کلام الہی اور وحی ربانی کے مفہوم سے یکسر بیگانہ  
تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کی تسکین کے لئے اس کا بھی ذکر  
کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا الْكِتَابَ يَكْفُرُونَ  
أَنَّهُمْ مُنْزَلٌ مِّن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ  
فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ (بقہ)

اور وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے  
ہیں کہ یہ قرآن آپ کے رب کی طرف سے  
حق کے ساتھ نازل ہوا ہے پس آپ شک  
کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔

ایک دوسری آیت میں ہے۔

وَيَرَى الَّذِينَ أُوْتُوا الْعِلْمَ  
الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ  
هُوَ الْحَقُّ (سبا)

اور وہ لوگ جنہیں علم دیا گیا ہے وہ جانتے  
ہیں کہ جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی جانب  
سے نازل کیا گیا ہے وہی حق ہے۔

ایک اہل کتاب کی شہادت کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی۔

لیکن چونکہ اس زمانہ میں عرب کے جاہل مشرکین بنو اسرائیل کے علم و فضل سے عجب  
تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن کے کتاب الہی ہونے کی تردید و کذب  
کیلئے ان علماء کا سہارا ڈھونڈتے تھے جس میں ان کو ہمیشہ ناکامی اس بنا پر ہوتی تھی کہ خدا  
خود ان علماء کی زبان سے آنحضرت کی رسالت اور قرآن کے وحی ہونے کی تصدیق کرادی تھی  
بلکہ ان میں بعض علماء تو ایسے تھے جنہوں نے سرکارِ دو عالم کا روئے انور دیکھتے ہی سراط

تسلیم خم کر دیا اور بے ساختہ بول اٹھے "إِنَّ هَذَا الْوَجْهَ لَيْسَ بِوَجْهِ كَاذِبٍ" بے شبہ یہ چہرہ کوئی کاذب چہرہ نہیں ہے" اس لئے ان منکرین وحی کو عار دلانے اور قرآن مجید کے وحی الہی ہونے کی حقیقت کو ان پر بطور الزام ثابت کرنے کے لئے ایک عالم بنی اسرائیل (عبداللہ بن سلام) کی شہادت کو بھی اہتمام کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ  
وَكُفْرْتُمْ بِهِمَا وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ  
بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ مِثْلِهِ فَأَمَّا  
اسْتَكْبَرْتُمْ إِنْ لَّمْ يَأْتِكُمْ  
الْقَوْمُ الظَّالِمِينَ (الاحقاف)

آپ فرمائیے بھلا دیکھو تو اگر یہ قرآن الہی کی  
طرف سے آیا ہو اور تم نے اس کو نہیں مانا اور جو  
اسرائیل کا ایک گواہ اس کی گواہی بھی دے چکا  
اور وہ ایمان لے آیا مگر تم نے غور کیا ہے  
تک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

سورہ بنی اسرائیل میں اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

قُلْ أَمْثُلًا مِّثْلًا بَلْ أُولَٰئِكَ هُمُ  
الَّذِينَ أُولُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا  
يَتْلَىٰ عَلَيْهِمْ خُرُونٌ لَّا تَذَكَّرْنَ  
سُجَّدًا أَوْ يَقُولُونَ سُبْحٰنَ رَبِّنَا  
إِنْ كَانِ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا

آپ کہئے تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ جن لوگوں کو قرآن  
سے پہلے علم ملا ہے ان پر جب اس قرآن  
کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اپنی تھوڑیوں کے  
بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں پاک  
ہے ہمارا رب اس کا وعدہ ہو کر رہا۔

لہٰذا آیت کا مفاد بھی یہ جانا ہے کہ قرآن کی حقانیت اور آنحضرت صلعم کی نبوت کی تصدیق وہ انصاف پسندار باب علم کر رہے ہیں جس قدر کھلی  
کتابوں کی بشارت و واقفیت ہے و عدالت سے اشارہ اس وعدہ ربانی کی طرف ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی زبانی تورات کتاب استناد میں  
اس طرح کیا گیا تھا ہے بنی اسرائیل میں تہاے بھائیوں (بنی اسمعیل) میں سے ایک بنی اٹھاؤں کا جسکے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا۔ علماء اہل  
کتاب قرآن مجید کو سن کر فوراً سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور وہ یقین کرتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہی رسول بشر ہے یہاں اور قرآن  
وہی کلام خداوندی ہے جس کا ذکر تورات میں کیا گیا ہے۔



ایک آیت میں مشرکین سے پوچھا گیا ہے کہ کیا علماء بنی اسرائیل کا قرآن کی حقیقت سے آگاہ ہونا تمہارے لئے خدا کی کوئی نشانی نہیں ہے؟

أَوَلَمْ يَكُنْ لَهُمُ آيَاتُنَا أَنْ يَتَعَلَّمُوا  
 علماء بنی اسرائیل (الشعراء) کو علماء بنی اسرائیل جانتے ہیں۔

مشرکین وحی سے بیگانہ تھے لیکن جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اہل کتاب وحی اور کلام الہی کی حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ خود ان کی آسمانی کتابوں کی پیش گوئیوں اور نبیوں کے مطابق بنو اسمعیل میں ایک نبی پیدا ہوگا اور اپنے ساتھ اللہ کی ایک کتاب بھی لائے گا۔ پس اگر یہ لوگ بھی قرآن کو وحی ماننے سے انکار کریں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان نہ لائیں تو ظاہر ہے ان سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو سکتا ہے، چونکہ اسلام قبول کرنے کی توقع مشرکین کی نسبت ان لوگوں سے زیادہ تھی اس لئے خدا نے حکم دیا کہ مسلمانوں کا معاملہ اہل کتاب کے ساتھ نرمی کا ہونا چاہیے مسلمانوں کو ان سے کہنا چاہیے کہ تم کو قرآن کے وحی ماننے میں کیا تامل ہے آخر تم بھی تو ہماری طرح ایک کتاب الہی پر ایمان رکھتے اور اسے منزل من اللہ مانتے ہو۔ دیکھئے کس بلوغ پیر میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَا تَجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي  
 اور تم اہل کتاب سے صرف بطریق احسن مجادل  
 هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا  
 کرو ان میں سے ان لوگوں کے سوا جنہوں نے  
 مِنْهُمْ وَقُولُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنزِلَ  
 دیکھا حق کر کے ظلم کیا ہے اور ان سے کہو کہ  
 إِلَيْنَا وَأُنزِلَ إِلَيْكُمْ وَإِلَهُنَا  
 ہم ایمان لے آئے ہیں اس کتاب پر جو تم پر  
 إِلَهُكُمْ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَكُمْ  
 نازل کی گئی اور اس پر بھی جو ہم پہ نازل کی  
 مُسْلِمُونَ وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَا  
 گئی ہے اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہے

اِنَّكَ الْكٰتِبُ ۙ فَالَّذِيْنَ اٰتٰهُمْ  
 الْكِتٰبَ يَوْمَئِذٍ بِهٖ وَمِنْ هٰؤُلَاءِ  
 لَآءِمٰنٌ يُّؤْمِنُ بِهَا وَمَا يَجْحَدُ  
 بِآيٰتِنَا اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ  
 (عنكبوت)

اور ہم اس کے مطیع و فرماں بردار ہیں اور اسی طرح  
 ہم نے اے محمد آپ پر کتاب نازل کی پس  
 جن لوگوں کو ہم نے کتاب سے رکھی تھی اور اس پر  
 ایمان لے آئے ہیں اور ان اہل مکہ میں سے بھی  
 بعض وہ ہیں جو اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں  
 ہماری آیات سے جو دوا نکار تو کافر ہی کرتے ہیں

مشرکین کے اعتراضات کی تردید | پھر ان استدلال و ترغیبات پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ بعض دریدہ  
 دہن مشرکین و کفار قرآن کی اس حیثیت پر جو اعتراضات کرتے تھے۔ ان سب کے بھی جوابات  
 دئے گئے ہیں یہ لوگ کہتے تھے کہ اگر قرآن اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں نسخ نہ پایا جاتا۔ قرآن  
 اس کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

وَ اِذَا بَدَّلْنَا آيٰتًا مَّكَانَ آيٰتِہٖا  
 وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا نُنزِلُ ۗ قَالُوْا اِنَّمَا اَنْتَ  
 مُفْتَرٍ ۗ بَلْ اَكْثَرُھُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ  
 (انحل)

اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت رکھتے  
 ہیں اور اللہ تعالیٰ جو کچھ نازل کرتا ہے وہ اے  
 خوب جانتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کلام  
 گھڑنے والے ہیں (نہیں بلکہ ان میں سے اکثر جانتے ہی نہیں ہیں)

اور آنحضرت کو اس کے جواب میں یہ کہنے کا امر کیا جاتا ہے۔

قُلْ نَزَّلَهُ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ  
 رَبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ  
 اٰمَنُوْا وَ هُدًى وَ بُشْرٰى  
 لِلْمُسْلِمِيْنَ  
 (انحل)

آپ کہہ دیجئے کہ اس قرآن کو میری رب کی  
 طرف سے روح القدس لیکر آئے ہیں تاکہ جو لوگ ایمان  
 لے آئے ہیں انکو ثابت قدمی حاصل ہو اور مسلمانوں  
 کیلئے ہدایت اور بشارت ہو۔

بعض کہتے تھے کہ حضور کا کوئی معلم ہے جو آپ کو یہ تمام باتیں سکھاتا ہے۔ اس قول میں یہ بہتان طراز خود دو قسم کے لوگ تھے کوئی کسی نصرانی غلام کو معلم بتاتا تھا اور کوئی کسی یہودی غلام کا نام لیتا تھا لیکن تھے یہ دونوں غلام عجمی اگر مشرکین کا یہ معلم عربی ہوتا تو وہ متعین طور پر اس کا نام لے سکتے تھے۔ قرآن مجید میں کفار کی اس بہتان طرازی اور اس کی تردید کا بیان اس طرح ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَيَقُولُونَ إِنَّمَا  
يُعَلِّمُهُمُ بَشَرٌ مِّثْلُ سَانَ الْبَدِيِّ  
يُلْحِدُونَ إِلَيْهِمْ إِعْجَبِيْ وَهَذَا  
لِسَانَ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ (النحل)

اور ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مشرکین کہتے ہیں  
آپ کو ایک انسان قرآن سکھاتا ہے (حالانکہ جس  
شخص کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں وہ عجمی ہے  
اور قرآن کی زبان صاف اور واضح عربی ہے

اس کے بعد ان لوگوں کے جھوٹ پر مہر توثیق اس طرح ثبت کی گئی ہے۔

إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا  
يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأُولَئِكَ  
هُمُ الْكَاذِبُونَ (النحل)

یہ جھوٹ کا افتراء ہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ کی  
آیات پر ایمان نہیں لاتے اور یہی وہ لوگ  
ہیں جو جھوٹے ہیں۔

بعض مشرکین کا خیال تھا کہ قرآن مجید کا افتاء شیاطین کی طرف سے ہوتا ہے اور عموماً  
کاہن (Astrologer) غیب کی خبریں بیان کرتے ہی ہیں۔ آپ بھی کاہن ہیں اور اس لئے  
غیب کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس وسوسہ شیطانی کی تردید بھی نہایت  
پر زور الفاظ میں کی ہے ارشاد ہے۔

وَمَا تَنْزَلَتْ بِهِ الشَّيْطَانُ وَمَا  
يَنْبَغِي لَهُمْ وَمَا يَسْتَفْتِحُونَ (الشعرا)

اس قرآن کو شیاطین نے نہیں اتارا اور نہ یہ انکے  
لائق ہے اور نہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔  
اور یہ قرآن مردود شیطان کا قول نہیں ہے

فَأَمِنَ تَدَاهِبُونَ (التكوير) پس تم لوگ کہاں جا رہے ہو۔

قرآن کو بعض لوگ شاعرانہ کلام کہتے تھے۔ اس کی بھی تردید کی گئی۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا يُوَفُونَ اور وہ دسترخوان کسی شاعر کا قول نہیں ہے

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَّا تَدَّكُرُونَ تم بہت ہی کم ایمان لاتے ہو اور نہ وہ کسی کاہن کا قول ہے۔ تم بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو

(الحاقة)

ان سب اعتراضات اور شیطانی وساوس کی تردید کے بعد اللہ تعالیٰ خود اپنی اور فرشتوں

کی شہادت سے قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

لَكِنَّ اللّٰهَ يَشْهَدُ بِمَا نُنزِلُ اِلَيْكَ لَكِنِ اللّٰهُ شَهِدٌ بِمَا نُنزِلُ اِلَيْكَ

کيا گیا ہے اللہ نے اس کو اپنے علم سے ہمارا ہے اور فرشتے بھی گواہ ہیں (اگرچہ) شہادت

وَكُنْفِي بِاللّٰهِ شَهِيدًا

کے لئے تو اللہ ہی کافی ہے۔ (نار)

مشرکین کا کوئی اور حیلہ کارگر نہیں ہوا تو انھوں نے یہی کہنا شروع کر دیا کہ بھلا یہ معجزہ

ہی کیا ہو انہی بھی عربی اور قرآن بھی عربی۔ اصل معجزہ تو جب ہوتا کہ عربی نبی پر عجمی قرآن نازل

ہوتا۔ قرآن نے مشرکین کے اس قول کی رکاکت کا بھی اظہار کیا ہے۔ فرمایا گیا ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَجْمًا لَّفَاقَوْا وَلَا فَصَّلَتْ اٰیٰتُهُمْ اَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ

اور اگر ہم قرآن کو عجمی قرآن بنا دیتے تو یہ لوگ کہتے کہ اس کی آیات مفصل کیوں نہیں ہیں بھلا زبان

عجمی اور لوگ عربی۔ آپ کہہ دیجئے کہ قرآن ایمان

دالوں کیلئے ہدایت اور نفاہی اور جو لوگ ایمان

نہیں لاتے ہیں ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور

قُلْ هُوَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْهُدٰى وَشَفَاؤُ

وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْ اٰذَانِهِمْ

وَقَرًا وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمٰى اُولٰٓئِكَ

یہ قرآن انکے حق میں اندھاپن ہی یہی لوگ ہیں  
یُنَادُونَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ  
جہنیں دور کی جگہ سے ندا دی جاتی ہے۔  
(حم السجدہ)

بعض کفار خود اپنا منہ چڑانے کے لئے کہتے تھے کہ قرآن (معاذ اللہ) من گھڑت ہے  
اور دوسرے لوگوں نے اس میں آپ کی مدد کی ہے۔ قرآن اسکی بھی تردید کرتا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا  
إِنْفُكٌ بِإِغْتِرَاكُمُ عَلَيْنَا  
کافر کہتے ہیں کہ یہ قرآن تو کچھ بھی نہیں نہایتنا  
ہے اور اس کے بنانے میں دوسرے لوگوں نے  
مدد کی ہے کوئی شبہ نہیں کہ ان لوگوں نے بالکل جھوٹ  
وَزُورًا (الفرقان) اور ظلم کی بات کہی ہے۔

اوپر جو آیات گزریں دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کے وحی  
ربانی ہونے کے دلائل بیان کئے ہیں اور دوسری وہ آیات ہیں جن میں قرآن مجید سے متعلق  
کفار و مشرکین کے یہودہ خیالات باطل توہمات اور شیطانی وساوس کی پر زور تردید کی گئی ہے  
ان آیات کے علاوہ کثرت سے ایسی آیات بھی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بالکل صاف اور واضح  
الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ قرآن مجید کا نزول اللہ کی جانب سے ہوا ہے اس مضمون کے بار بار تکرار  
سے منشا یہی ہے کہ اسلامی عقائد و اعمال کا یہ اساسی عقیدہ اس طرح لوگوں کے دل و دماغ میں  
مترسم ہو جائے کہ انھیں اس بارہ میں ذرا سا بھی تذبذب اور شک باقی نہ رہے آیات ذیل ملاحظہ کیجئے۔

(۱) اِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبَارَكٍ  
(۲) اِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ (قدر)  
(۳) تَنْزِيلًا قِيمِينَ خَلَقَ الْأَرْضَ  
وَالسَّمَوَاتِ الْعُلَى (طہ)

ہم نے شبہ اس قرآن کو مبارک رات میں اتارا  
بے شبہ ہم نے اس کو شب قدر میں نازل کیا  
اس قرآن کا نزول اس ذات کی طرف سے ہے  
جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا

(۴) قُلْ أَنْزَلْنَاهُ الَّذِي يَلْعَمُ السِّرَّ  
 فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (الفرقان)  
 (۵) إِنَّا نَخْنُ نُزِّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنْزِيلًا  
 (۶) إِنَّا نَخْنُ نُزِّلْنَا الَّذِي كُرِّهُنَا لِمَا فَطَرْنَا  
 آپ کہہ دیجئے کہ اس قرآن کو اس ذات نے نازل  
 کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھیدوں واقف  
 ہم نے ہی قرآن مجید آپ پر پھر پھر نازل کیا ہے  
 ہم نے ہی اس نصیحت (قرآن) کو تارا ہوا ہم ہی اسکی  
 حفاظت کرنے والے ہیں۔

پورے قرآن کو اول سے آخر تک پڑھئے تو اس مضمون کی آیات چند ایک نہیں بلکہ  
 بہت زیادہ ملیں گی واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے اپنے وحی ہونے کے مضمون کو جس شد و مد  
 اور تاکید و تکرار سے بیان کیا ہے دنیا کی کسی اور کتاب سماوی نے اپنے متعلق اس طرح بیان  
 نہیں کیا اس سلسلہ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو تشنہ تمکیمیں رہ گیا ہو۔

حضرت جبریل کی توثیق | یہ ظاہر ہے کہ وحی اللہ کی طرف سے انبیا پر عموماً حضرت جبریل کے واسطے  
 سے نازل ہوتی رہی ہے اور خود قرآن بھی آنحضرت پر اسی طرح نازل ہوا۔ اس بنا پر قرآن میں  
 حضرت جبریل کی وساطت کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور ان کی توثیق کر کے اس شبہ کو دور کر دیا گیا ہے  
 کہ ممکن ہے ان سے پیغام الہی کے پہنچانے میں کوئی تغیر و تبدل ہو گیا ہو۔ ارشاد ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلْجِبْرِيلِ فَإِنَّهُ  
 نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ  
 آپ کہہ دیجئے کہ جو لوگ جبریل کے دشمن ہیں رہوا  
 کریں انھوں نے ہی تو اللہ کے حکم سے آپ  
 پر قرآن اتارا ہے  
 (البقرہ)

سورہ بخل میں ہے۔

قُلْ نَزَّلْنَاهُ رُوحَ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّكَ  
 بِالْحَقِّ لِيُنذِرَ الَّذِينَ آمَنُوا وَ  
 آپ کہہ دیجئے کہ اس کو روح القدس نے میری رب  
 کی طرف سچی کیساتھ نازل کیا ہے تاکہ وہ ایمان

هُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ  
 والوں کو ثابت قدم رکھے اور وہ مسلمانوں کی نصیحت اور

سورہ شعراء میں انہیں روح الامین کہا گیا ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جبریل امین کامل ہیں ان سے کسی خیانت یا کوتاہی کا اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ فرمایا گیا ہے۔

نَزَلَ بِرُوحِ الْأَمِينِ عَلَيَّ  
 اس قرآن کو روح الامین (جبریل) نے آپ کے قلب  
 قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ (اشعرا)

پہتا رہتا ہے تاکہ آپ اندازہ کر لیں کہ نبیوں میں سے ہو جائیں  
 سورہ تکویر میں اس سے بھی زیادہ تاکید کے ساتھ حضرت جبریل کی توثیق لگی ہے۔ ارشاد ہے۔

إِنَّا نَقُولُ رَسُولٌ كَرِيمٌ  
 بیشک وہ مغزرقاصد کا کلام ہے جو قوت والا ہے  
 عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٌ مُطَاعٌ  
 خدائے عرش کے نزدیک مرتبہ والا ہے اس کی  
 طاعت کی جاتی ہے اور وہاں امین و معتبر ہے  
 ثَمَّ آمِينَ

سورہ النجم میں ہے۔

عَلَّمَنَا شَدِيدِ الْقُوَىٰ ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ  
 آنحضرت کو سخت قوتوں والے اور زوردار نے سکھایا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توثیق | حضرت جبریل کے تعارف اور ان کی توثیق کے بعد ضرورت تھی کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی توثیق کی جاتی تاکہ کسی شخص کو یہ شبہ نہ ہو کہ ممکن ہے آپ سے وحی کے

پہنچانے میں کوئی کوتاہی ہوئی ہو ساتھ ہی ضروری تھا کہ اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح

حیثیت بھی بیان کر دی جاتی جس سے یہ معلوم ہو جاتا کہ حضور تو محض ایک پیغمبر ہیں۔ اللہ کی طرف

سے آپ پر جو وحی نازل ہوتی ہے آپ اس کو بے کم و کاست خدا کے بندوں تک پہنچانے پر

مامور ہیں۔ پھر چونکہ اس منصب میں عظیم درمالت کے لئے خدائے آپ کا انتخاب کیا ہے۔ اس

لئے آپ کے ذہنی اور دماغی قوی بھی عام انسانوں سے زیادہ بلند اور مضبوط ہیں جس کے باعث

آپ وحی میں نہ کوئی تغیر و تبدل کر سکتے ہیں اور نہ اس کے کسی لفظ اور معنی کا مفہوم سمجھنے میں آپ سے

غلطی ہو سکتی ہے۔ رب الوحی نے یہ سب باتیں بھی قرآن میں بیان کی ہیں تاکہ لوگوں پر رحمت  
تمام ہو جائے۔

قرآن کا انفر کیا ہی نہیں جاسکتا | اس سلسلہ میں بعض آیات تو وہ ہیں جن میں عمومی طور پر فرمایا  
گیا ہے کہ یہ قرآن سوائے اللہ کے کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس عموم کے ماتحت خود سرور کا نام  
کی ذاتِ ستودہ صفات بھی داخل ہے۔ مثلاً یہ آیت۔

وَمَا كَانَ هَذَا الْقُرْآنُ أَنْ يُفْتَرَىٰ  
مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ نَقْلٌ  
الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ  
لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ

اور یہ قرآن وہ نہیں ہے کہ اس کو غیر خدا نے گھڑ لیا  
ہو لیکن اس کتاب کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے  
نازل ہوئی اور اس کی ہی تفصیل ہے اس قرآن کے  
رب العالمین کی طرف سے ہونے میں کوئی شبہ نہیں

آنحضرت صلعم کے متعلق قرآنی تصریحات | ان کے علاوہ دوسری آیات وہ ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ  
علیہ وسلم کی ذات سے متعلق چند تصریحات و توضیحات ہیں ہم ذیل میں انہیں نمبر وار لکھتے ہیں۔  
۱۱) ایک آیت میں بتایا گیا ہے کہ آپ بھی اور انسانوں کی طرح ایک انسان میں فرق  
صرف یہ ہے کہ آپ پر وحی اترتی ہے۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ

آپ فرمائیے میں بھی جیسا کہ ایک بشر ہوں البتہ مجھ پر وحی

اور آج یہ کوئی نئی بات نہیں ہے آپ سے پہلے بھی انبیاء آتے رہے اور ان پر وحی نازل ہوتی رہی ہے۔ بس  
آپ کا فرض منصبی یہی ہے کہ خدا کا پیام جو ان لوگوں تک پہنچا دیں اس کے ماسوا آپ کو یہ بھی  
معلوم نہیں کہ خود آپ کے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔ قُلْ مَا كُنْتُ  
بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يَفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ ۗ أَفَإِن لَّمْ يَهِتَدُوا بِنُورِهِمْ لَيَضَلُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ كَمَا يَضَلُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ  
تو صرف صاف صاف ڈرانے والے ہیں۔ اسی آیت کے آخر میں ہے۔



إِن أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ

(۲) حضور کو لوگوں کے ثواب و عقاب میں بھی کوئی دخل نہیں ہوا ارشادِ خداوندی ہے۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ  
يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ  
فَاتَّهَمُوا ظَالِمُونَ (نساء)

آپ کو اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ اللہ  
ان کو توبہ کی توفیق عطا فرمائے یا ان کو عذاب  
دے وہ تو بہر حال ظالم ہیں۔

(۳) حضور کو اس کا بھی علم نہیں ہے کہ خدا نے لوگوں سے جس چیز کا وعدہ کیا ہے وہ

قریب ہے یا بعید ہے۔ فرماتے ہیں۔

قُلْ إِنِ ادْرِي أَقْرَابٌ مَّا وَعَدْتُّنَّ  
أَمْ يُجْعَلُ لَهَا رَجِيءٌ

آپ کہہ دیجئے میں نہیں جانتا کہ تم سے جن چیز  
کا وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے یا نہیں یا میرا

ب اس کے لئے کوئی مدت مقرر کرے گا (جن)

بعض مشرکین کہہ آئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ آپ کی عام پند و نصائح تو بڑی عمدہ ہیں لیکن قرآن میں بت پرستی کی جو مذمت کی جاتی ہے اس سے تکلیف ہوتی ہے اس لئے آپ یا تو موجودہ قرآن کو چھوڑ کر کوئی دوسرا قرآن لے آئیے جس میں ایسی دلخراشیاں باتیں نہ ہوں یا پھر کچھ اور نہیں تو اس قرآن میں ہی ترمیم اور تغیر و تبدل کر دیجئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی

قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا إِنَّا  
بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا أَوْ بَدَّلْنَاهُ  
مَا كُنْتُمْ فِيهِ يَتْلُونَ إِنَّا بَدَّلْنَاهُ  
نَفْسِي إِنِ اتَّبَعُوا إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ  
أَخَافُ أَنْ عَصَيْتَ رَبِّي عَذَابٌ

جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی امید نہیں ہے یعنی  
حشر کا عقیدہ نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ آپ  
اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آئیے یا  
اس کو بدل دیجئے آپ فرما دیجئے کہ میں قرآن کو  
اپنی طرف سے بدل نہیں سکتا۔ میں تو

يَوْمٍ عَظِيمٍ

اسی چیز کی پیروی کر دینا جسکی وحی مجھ کو بھیجی گئی ہے

اگر میں نے نافرمانی خداوندی کی تو میں اپنے رب

(رؤس)

کے سخت دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وحی کو بعینہ پہنچا دیتے ہیں اور اس میں ہوا دھوس کا بالکل

خل نہیں ہوتا۔ اعلان واجب الادعان ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اِنْ هُوَ

آپ اپنی طرف سے کچھ نہیں فرماتے آپ کا نطق

اِلَّا وْحٰی يُوحٰی (انجم)

وحی ہے جس کی آپ پر وحی ہوتی ہے

(۵) اور آپ نطق عن الہویٰ کر بھی نہیں سکتے۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقْوَالِ

اگر وہ (محمد) بعض باتیں بنا کر ہماری طرف

لَاخِذًا نَّامِنُهَا بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا

منوب کر دیتے تو ہم ضرور ان کا دامن ہاتھ پکڑ

مِنْهَا الْوَيْتَيْنِ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ

لیتے پھر ان کی رگ کاٹ ڈالتے اور تم میں سے

عَنْهَا حَاجِزِينَ (الحاقہ)

کوئی اس کا روکنے والا نہ ہوتا۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے۔

اَمْ يَقُولُونَ افْتَرَىٰ عَلٰی اللّٰهِ كَذِبًا

کیا وہ کہتے ہیں کہ محمد نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے

فَاِنْ يَشَاءُ اللّٰهُ يَخْتِمُ عَلٰی قَلْبِكَ

اگر اللہ چاہتا تو وہ آپ کے دل پر پھر لگا دیتا

وَيَسِّرُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيَجْعَلُ الْحَقَّ

اللہ باطل کو مٹاتا اور حق کو اپنے کلمات سے

بِكَلِمَتٍ اِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ

ثابت کرتا ہے تبہ وہ دلوں کے سرازیر و خوب واقف ہے

(۶) کوئی شبہ نہیں کہ آپ دیانت دار اور سچے قاصد ہیں اللہ کی وحی بعینہ لوگوں

تک پہنچا دیتے ہیں۔

اِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيْمٍ (الحاقة) کوئی شبہ نہیں کہ قرآن رسول کریم کا قول ہے

۱۷۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھانا اور اس کو آپ کے سینہ اقدس و اطہر میں محفوظ رکھنا یہ سب اللہ کے ذمہ ہے اس بنا پر آپ سے اس کے یاد کرنے اور سمجھنے میں نہ کوئی غلطی ہو سکتی ہے اور نہ آپ کو اس میں کوئی سہو پیش آ سکتا ہی یہی وجہ ہے کہ سید کوئین فداہ ابی دامتی اس خیال سے کہ کہیں وحی الہی کا کوئی لفظ گوشہ یاد سے اوجھل نہ ہو جائے نزول وحی کے وقت اپنی زبان حق ترجمان کو جلدی جلدی حرکت دیتے تھے تو خدائے ایسا کرنے سے منع فرمایا ارشاد ہے۔

لَا تَخْرُكُ بِهَا لِسَانَكَ لِتَتَّجَلَ بِهَا  
 اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُمْ وَقُرْآنَهُمْ فَاِذَا  
 قُرْآنَهُمْ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُمْ  
 آپ جلدی جلدی پڑھنے کے لئے اپنی زبان کو  
 حرکت نہ دیجئے قرآن کا (آپ کے سینہ میں) جمع  
 کرنا اور اس کا پڑھنا تو ہمارا ذمہ ہے جب ہم آپ کو  
 پڑھائیں تو آپ بھی اسکا اتباع کیجئے۔

یہ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے سورہ نگویر میں "رسول کریم" سے مراد جبریل ہیں لیکن سورہ الحاقہ میں "رسول کریم" سے مراد آنحضرت ہیں دونوں سورتوں میں "رسول کریم" کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے آنحضرت اور جبریل دونوں کو رسول اس لئے کہا گیا ہے کہ جبریل اللہ اور آنحضرت صلعم کے اور سرور دو عالم اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان نامہ بری (رسالت) کا فرض انجام دیتے ہیں اور چونکہ دونوں اپنے اپنے فریضہ منصبی کے ادا کرنے میں نہایت دیانت دار اور امین ہیں اس لئے دونوں "رسول کریم" ہیں کسی شخص کو قول کے لفظ سے اشتباہ نہ ہونا چاہیے کہ اس کی اضافت رسول کی طرف ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ قاصد کا قول اگرچہ اس کی زبان سے ادا ہوتا ہے اور اس لئے اس کا قول (مجازاً) کہلاتا ہے۔ لیکن دراصل وہ ہوتا ہے کلام اس شخص کا جس کا نامہ بریہ قاصد ہوتا ہے۔

لہٰذا کوڑھیان باطن اگر آفتاب حقیقت کی ایک ہلکی سی کرن بھی دیکھ سکیں تو انہیں معلوم ہو گا کہ قرآن مجید کے وحی الہی ہونے کے تمام دلائل ایک طرف اور صرف "لَا تَخْرُكُ بِهَا لِسَانَكَ لِتَتَّجَلَ بِهَا" ایک طرف یہ مختصر سی آیت اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ قرآن حضور کا اپنا کلام نہیں کون نہیں جانتا کہ کوئی متکلم کلام کرتے وقت اپنی زبان کو اس لئے جلد جلد حرکت نہیں دیتا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اسے یاد رہ جائے (تقیہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ)

ایک آیت میں ہے۔

سَنَقِرُّكَ فَلَا تَنسَى إِلَّا مَشَاءَ  
اللَّهِ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَى  
وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرَى (الاعلى)

ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہ بھولیں گے اگر وہ جسے اللہ  
ہی چاہے۔ وہ کھلی اور چھپی باتوں کو جانتا ہے اور ہم آہستہ آہستہ  
آپ کو آسانی تک پہنچائیں گے۔

(۸) صرف پڑھانا اور یاد کرنا ہی نہیں بلکہ اس کی تشریح و توضیح بھی اللہ ہی کے ذمہ ہے

ثُمَّ إِنَّا عَلَيْنَا بَيَانًا (القصہ)

پھر اس کو سمجھانا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سلسلہ وحی جتنے امور بحث طلب ہو سکتے

تھے دیکھو قرآن نے کس طرح ان میں سے ایک ایک امر کے بارہ میں واضح تصریحات کی ہیں۔

قرآن آپ کے قلب پر نازل ہوا | ساتھ ہی اس نے نزول قرآن کی کیفیت بھی بیان کی ہے کہ اس

کا تعلق حواس ظاہری سے نہیں بلکہ دل سے ہے ارشاد ہے۔

فَاتَّخَذْنَا نَزْلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ  
جبریل نے قرآن کو اللہ کے حکم سے آپ کے دل پر اتارا

ایک اور مقام پر ہے۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَى قَلْبِكَ  
قرآن کو روح الامین آپ کے قلب پر لے کر

لَتَكُونَ مِنَ الْمُنذَرِينَ  
نازل ہوئے ہیں تاکہ آپ ڈرا نیواؤں میں سے ہوں

روح محفوظ کا بیان | ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مطہر

پر نازل ہونے سے پہلے روح محفوظ میں موجود تھا۔ ارشاد ہے۔

رتقیہ حاشیہ ص ۱۰۲ گزشتہ یعنی بات ہے کہ حضور پر مبداء فیاض کی جانب سے قرآن مجید کا فیضان ہوا تھا اور آپ بہ تقاضا  
بشریت اسے یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو جلد جلد حرکت دے رہے تھے اس پر حضرت حق جل مجدہ نے یہ آیت نازل فرمائی

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ  
بلکہ وہ قرآن مجید ہے جو لوح محفوظ میں ہے  
اور صرف قرآن مجید میں نہیں بلکہ دنیا کے تمام واقعات و اشیاء کا تذکرہ اس میں موجود  
اور مثبت ہے نہ مایا گیا ہے۔

كُلُّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ  
ہم نے تمام باتوں کو ایک واضح کتاب میں جمع  
کر دیا ہے۔

ایک آیت میں لوح محفوظ کو کتاب مبین کہا گیا ہے اور اس میں بھی اس کی اسی صفت  
کا بیان ہے۔

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا  
اللَّهُ هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبُرُوجِ وَمَا  
تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا  
حَبَّةٌ فِي ظِلْمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا  
رُطْبٌ فِي سَائِلَاتِ الْيَأْسِ إِلَّا فِي كِتَابٍ  
مُبِينٍ ط  
اور اللہ کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو صرف  
اللہ ہی جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان  
چیزوں کو جو خشکی میں اور سمندر میں ہیں اور جو پتہ  
گرتا ہے اور زمین کی تاریکیوں میں جو دانہ گرتا  
ہے اللہ تعالیٰ ہی اس کو جانتا ہے اور کوئی تر  
اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں ہے جو کھلی ہوئی  
اور واضح کتاب میں نہ ہو۔

سورہ حدید میں ارشاد ہوتا ہے -

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ  
وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ  
أَنْ نُبْرَأََهَا إِنَّ ذَلِكَ عَلَى  
اللَّهِ يَسِيرٌ ط  
لگ میں یا خود تمہارے اندر جو مصائب نازل  
ہوئے ہیں ان میں کوئی مصیبت ایسی نہیں  
ہے جو اس کو پیدا کرنے سے پہلے لوح محفوظ  
میں محفوظ نہ ہو۔ یہ بے شبہ اللہ کے لئے آسان ہے

سورہ القمر میں اس کا بیان اس طرح ہے -

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزَّبْرِ وَكُلُّ  
صَنِيعٍ وَكَبِيرٍ مُسْتَطَرٌّ

اور ہر وہ چیز جو انہوں نے کی لکھی ہوئی ہے  
دروں میں اور ہر چھوٹی بڑی چیز لکھی جا چکی

ان آیات کی روشنی میں قرآن مجید سے لوح محفوظ کی نسبت صرف اتنی بات ثابت

ہوتی ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز ہے جس میں بد و آفرینش سے انتہا تک کے تمام حالات و واقعات

ادام و نواہی اور رموز و اسرار لکھے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ قرآن بھی اُس میں لکھا ہوا ہے۔

اس سلسلہ میں اتنی بات کا اور اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ قرآن میں آیات کتابت و تحریر میں سقلم کا بھی ذکر ہر ارشاد

ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ  
ن قسم ہر قلم کی اور اس کی جس سے لکھتے ہیں

لیکن اس لوح کی شکل و صورت کیسی ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن نے حسب دستور

عش و کرسی کی طرح اس کی بھی کوئی حقیقت بیان نہیں کی۔ البتہ بعض کتب احادیث میں اس کے

متعلق حضرت ابن عباس کا ایک اثر ملتا ہے لیکن اس سے بھی کوئی حقیقت متعین نہیں ہوتی بعض

لوگوں نے کہا ہے کہ لوح محفوظ ایک جوہر مجرد ہے کسی چیز میں نہیں اور وہ صور علیہ کے لئے بمنزلہ آئینہ

کے ہے لیکن کتاب و سنت کے ظواہر الفاظ سے اس کی بتن تائید نہیں ہوتی بطور تمثیل یہ کہا

جاسکتا ہے کہ جس طرح حافظ قرآن کے دماغ میں قرآن مجید کے کلمات ثبت ہوتے ہیں لیکن

وہ اس میں منقوش و مکتوب نہیں ہوتے اسی طرح لوح محفوظ میں تمام عالم کے مقادیر ثبت ہیں لیکن

عام الواح دنیا پر قیاس کر کے ان کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس میں مقادیر منقوش ہیں۔ واللہ اعلم

قرآن کو کلام اللہ بھی کہا گیا ہے | پھر قرآن مجید کو صرف وحی کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اسے صاف

لفظوں میں کلام اللہ بھی کہا گیا ہے۔ ارشاد ہے -

وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ  
اور اگر کوئی مشرک آپ سے من طلب کرے تو

فَاَجْرُهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ

آپ اسکو میں دیکھے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے

قول بشر کہنے پر عذاب | اب چونکہ حضرت جبریل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توثیق کر کے قرآن کے

دوزخ کی وعید | وحی اور منزل من اللہ ہونے کے ثبوت میں اللہ کی طرف سے حجت تمام

ہو چکی ہے اس لئے اب کسی منکر کا عذر لائق پذیرائی نہیں ہو سکتا اور جو شخص اب بھی قرآن کریم

کو کلام بشر یا جادو کہتا ہے وہ بے شبہ دوزخ کے عذاب کا سزاوار ہے ایک مرتبہ ولید

بن مغیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے قرآن پڑھ کر سنایا وہ

کسی قدر اس سے متاثر ہوا۔ مگر الوجہل اور دوسرے سردارانِ قریش نے اس کو درغلا یا اور

پوچھا قرآن کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ کہنے لگا "ذرا سوچ لوں" آخر تیسری بدل کر اور

منہ بنا کر بولا "یہ تو بابل کا جادو ہے جو نقل ہوتا چلا آتا ہے اور یہ تو انسان کا قول ہے" اس پر

قرآن مجید میں آیت ذیل اتری جس میں عذاب دوزخ کی وعید کی گئی ہے۔

أَنَّهُ فَلَکَرٌ وَقَدَّارٌ فَقَتِلَ کَیْفَ قَدَّارٌ

اس نے سوچا اور دل میں ایک بات بھڑائی وہ

تَمَّ قَتِلَ کَیْفَ قَدَّارٌ تَمَّ نَظَرٌ تَمَّ عَبَسَ وَ

مارا ہی جائے اس نے دل میں کیا بات بھڑائی

تَمَّ دَبَّرَ وَاسْتَكْبَرَ فَقَالَ إِنَّ هَذَا

تھی پھر وہ مارا ہی جائے اس نے کیا بھڑایا تھا

إِلَّا سِحْرٌ نُّوْثٌ إِنَّ هَذَا إِلَّا قَوْلُ

پھر اس نے دیکھا تیسری چڑھائی اور منہ پھلایا

النَّبَشِی

پھر پشت پھری اور غور کیا اور کہنے لگا یہ تو جادو ہے

جو منقول ہو کر آتا ہے یہ تو قول بشر ہی ہے۔

یہاں تک تو ولید بن مغیرہ کا مقولہ اور اس کے احوال و کوائف کا بیان تھا اس پر

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

سَاَصْلِبُ سَقْرًا وَمَا اَدْرَاکَ مَا

اب اس کو میں دوزخ میں ڈالوں گا اور آپ کیا

سَقْمًا لَا تَبْقَى وَلَا تَذَرُ لَوْ أَحْتَمُ  
 سمجھے کہ کیسی ہے وہ دوزخ وہ نہ کچھ باقی رکھتی  
 لِلْبَشَرِ (المدثر) ہے اور نہ چھوڑتی ہر وہ آدمیوں کو جھلسائینے والی

قرآن مع عربی الفاظ کے وحی الہی ہے | اب صرف ایک مسئلہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن جس کو اللہ کا کلام کہا گیا ہے وہ صرف معانی و مطالب کے لحاظ سے ہے یا عربی الفاظ اور ان کی مخصوص نشست و ترکیب کے لحاظ سے بھی۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہ لفظ و معنی کی تفریق خاص عہد نبوت میں ان لوگوں نے بھی نہیں کی جو رسول صادق و امین کی تکذیب کے لئے ایک ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈتے تھے وہ خود ارباب لسان تھے۔ زبان کی فصاحت و بلاغت اور اتنا لیب بیان کی مہارت میں یگانہ روزگار تھے اس کے باوجود قرآنی الفاظ کے اعجاز نے انہیں اس درجہ متاثر کر دیا تھا کہ وہ پورے قرآن کو تو مع اس کے الفاظ و معانی کے "ساحرانہ" کاہستانہ یا شاعرانہ کلام کہتے تھے لیکن یہ کہنے کی ہمت انہیں بھی نہیں ہوئی کہ محمد صلعم کے الفاظ میں ایسی کوئی ایسی خصوصیت ہے کہ وہ انہیں بھی اللہ کا نازل کیا ہوا کہتے ہیں ایسے جملے اور ایسی عبارتیں تو ہم بھی بول اور لکھ سکتے ہیں۔

لیکن خدائے علام الغیوب کو علم تھا کہ اب نہیں تو بعد میں تفسیر اور عقلیت پرستی کے دور میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو ایک طرف اپنے مسلمان ہونے کا ادعا کریں گے اور دوسری طرف اپنے تفسیر کا بھرم قائم رکھنے کے لئے قرآن کو معانی و مطالب کے لحاظ سے تو وحی خداوندی تسلیم کریں گے لیکن اس کے الفاظ کی نسبت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے میں متامل نہیں ہونگے اس بنا پر قرآن مجید نے اس مسئلہ کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا اور اسکی بھی تصریح کر دی کہ قرآن مع الفاظ عربی کے اللہ کا کلام ہے اور اللہ کی طرف سے وحی کا نزول انہیں عربی الفاظ میں ہوا ہے



ارشاد ہے۔

قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ      فتران عربی بغیر کسی کجی کے

علاوہ ازیں آیات ذیل غور سے پڑھے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا      ہم نے تفران عربی نازل کیا ہے

إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ      بے شبہ ہم نے اس کو عربی تفران بنایا

تَعْقِلُونَ      ہے تاکہ تم سمجھو۔

وَلَدًا إِلَيْكَ أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا      اور اسی طرح ہم نے اس کو تفران عربی بنا کر اتارا ہے

وَلَدًا إِلَيْكَ أَنْزَلْنَاهُ حَكَمًا عَرَبِيًّا      اور سیطرہ ہم نے اس کو عربی تفران بنا کر اتارا ہے

دیکھئے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مطلق قرآن کے نزول کی نسبت اپنی طرف نہیں

کی بلکہ اس تفران کی نسبت اپنی طرف کی ہے جو عربی زبان میں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہونا بھی

یہی چاہئے تھا کیونکہ محض معانی و مطالب کے القاء و ایجاد کے کوئی معنی ہی نہیں ظاہر ہے کہ جس

طرح معانی کا زبان سے اظہار بغیر الفاظ کے نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح معانی کا دل میں خطور اور

تعلین بھی الفاظ کے بغیر ناممکن ہے۔

منقحات و نتائج | اب ان سب آیات کو سامنے رکھ کر غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح قرآن

مجید کی نسبت ایک ایک بات کو کھول کر بیان کیا ہے اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس میں رمز

یہی ہے کہ لوگوں کو قرآن مجید کے وحی الہی ہونے میں کوئی شک اور تردد نہ رہے یہی مسئلہ

دین کی اساس اور بنیاد ہے اس لئے ضرورت تھی کہ اس پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا۔ ان تمام

آیات سے حسب ذیل نتائج ثابت ہوتے ہیں۔

(۱) قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور معنی الفاظ و معانی کے۔

(۲) حضرت جبریل سے لیکر نازل ہوئے ہیں۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ نازل ہوا ہے۔

(۴) جبریل اور آنحضرت دونوں بے انتہا امین اور دیانت دار ہیں۔

(۵) آنحضرت نے یا کسی اور شخص نے اس کو بنایا نہیں ہے۔

(۶) شیاطین نے اس کا انکار نہیں کیا۔

(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رسول کریم تھے۔ قرآن آپ پر جیسا نازل ہوا تھا ویسا ہی

لوگوں تک پہنچا دیتے تھے۔ آپ کو اس میں نہ نسیان ہو سکتا تھا اور نہ کوئی مغالطہ۔

(۸) آپ شاعر کاہن، یا ساحران میں سے کچھ نہ تھے۔

(۹) قرآن کے منزل من اللہ ہونے کے دلائل قاطع کا بیان۔

(۱۰) اس پر کفار و مشرکین کے اعتراضات و وساوس کا حتمی رد۔

(۱۱) عام انسانوں تک اللہ کے اس کلام کے پہنچنے کا ذریعہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم کی ذات گرامی ہے اور آپ چونکہ ہر طرح اللہ کے معتمد اور اس کے سچے رسول ہیں اس لئے جو کلام

آپ کی وساطت سے پہنچا ہے اور خود آنحضرت نے بھی اسے خدا کا کلام کہا ہے ہر انسان کا فرض ہے

کہ بے چون و چرا اسے قبول کرے اور اس کے کلام اللہ ہونے پر ایمان لے آئے۔

مندرجہ بالا سانچے قرآن مجید کے اشارۃ النص یا دلالت النص سے نہیں بلکہ ظواہر نصوص

سے واضح طور پر برآمد ہوتے ہیں اور اس بنا پر جس طرح کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا

جب تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول نہ مانے اسی طرح ایسے شخص کا ادعا اسلام

صحیح نہیں ہے جو مندرجہ بالا تنقیحات پر ایمان و اعتقاد نہ رکھے۔ جمہور امت کا ہر قرن اور ہر زمانہ

میں اس پر اتفاق رہا ہے اور جس کسی نے اس کا خلاف کیا اسے مژدہ قرار دیکر گردن زدونی قرار دیا گیا ہے

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں "سلف ان لوگوں کو جہمی کہتے تھے جو صفات کی نفی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ قرآن مخلوق ہے اور یہ کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رویت نہیں ہوگی، کیونکہ ہم سب سے پہلا شخص ہے جس نے نفی اسماء و صفات کی باعیت جاری کی اور اس میں انتہائی غلو اور انہماک سے کام لے کر بار بار اس کی دعوت دی جعد بن درہم نے بھی مسلمانوں کو اس فتنہ عظیم میں مبتلا کرنا چاہا تو خالد بن عبداللہ القسری نے جو عراق کا گورنر تھا عین بقرعید کے دن جعد کو ذبح کر دیا اور ذبح کرتے وقت یہ الفاظ کہتے "لوگو تم اپنی اپنی قربانیاں کرو اللہ تمہاری قربانیاں قبول فرمائے۔ میں جعد بن درہم کو قربان کرتا ہوں شیخ صفات کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ نے حضرت ابراہیم کو اپنا دوست نہیں بنایا تھا اور اس نے حضرت موسیٰ سے کلام بھی نہیں کیا تھا اللہ ان تمام چیزوں سے بلند و بالا ہے۔"

پس جہاں تک اسلامی عقائد کا تعلق ہے ہر اس شخص کے لئے جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے ناگزیر ہے کہ وہ قرآن مجید کو معہ الفاظ و معانی کے اللہ کلام مانے اور دل سے اس کا اعتقاد جازم رکھے۔ دنیا بھر کے تمام حزبی اختلافات کے باوجود یہی اعتقاد ایک ایسا رشتہ اتحاد ہے جو دنیا کے تمام مسلمانوں کے درمیان ہر قرن اور ہر زمانہ میں قائم رہا ہے اگر کوئی مدعی اسلام آج اس اعتقاد پر قائم نہیں ہے تو جس طرح زمانہ سلف میں ایسے گمراہ لوگوں کو مسلمانوں کی برادری سے خارج کر دیا گیا تھا۔ یہ شخص بھی ہمارے اسی سلوک کا مستحق ہونا چاہیے۔"

# خدا کی صفات ذاتیہ پر ایک عام بحث

موجودات کی تین قسمیں ہیں (۱) وہ ذوات جن کا وجود خارج میں متحقق ہے (۲) افعال جو ذوات سے صادر ہوتے اور مفعولات میں پائے جاتے ہیں (۳) صفات جو ذوات کے حالات ہوتی ہیں۔ وجود کے اعتبار سے ان تینوں میں فرق یہ ہے کہ ذوات کا وجود خود ان کے ساتھ قائم ہوتا ہے یعنی ان کا وجود اضافی نہیں بلکہ حقیقی ہوتا ہے اس کے برعکس افعال کا وجود فاعل کے وجود پر موقوف ہوتا ہے۔ ورنہ فی حد ذاتہ ان کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اب یہ صفات تو ان کی حقیقت یہ ہے کہ یہ ان حالتوں یا کیفیتوں کا نام ہے جو ذوات میں پائی جاتی ہیں اور صفات کا وجود ذوات میں ان کے ساتھ ساتھ اور ان کی وجہ سے ہی ہوتا ہے۔ افعال میں اور صفات میں فرق یہی ہے کہ صفات کا قیام ذات کے ساتھ ہوتا ہے اور افعال کا صدور اگرچہ فاعل سے ہوتا ہے لیکن ان کا قیام و بقا فاعل کی ذات کے ساتھ نہیں ہوتا۔ پہلی قسم کی مثال انسان ہے۔ دوسری قسم کی مثال حرکت اور تیسری نوع کی مثال جبار، سخاوت اور شجاعت وغیرہ ہے۔

یہ مسلم ہے کہ کوئی موجود بھی 'خواہ وہ ذات ہو یا صفت ہو یا فعل ہو اس کا وجود بہر حال از خود نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مصدر و منبع ذات واجب الوجود ہے پھر یہ بھی مسلم ہے کہ موجودات ثلاثہ میں اولاً وجود ذوات کا ہوتا ہے پھر صفات کا اور ان کے بعد افعال وجود پذیر ہوتے ہیں۔ اب اس پر اس ایک مقدمہ کا اور اضافہ کیجئے کہ صفات و حالات و قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو اشیاء کے لئے بند و اہا پائے جاتے ہیں یعنی کسی شے کا وہ شے ہونا ہی ان صفات کے وجود کی سب سے

بڑی دلیل ہوتا ہے اور اس کے لئے کسی اور علت موجبہ کی احتیاج نہیں ہوتی اس کے علاوہ دوسری قسم کی صفات وہ ہیں جن کے وجود کے لئے محض کسی شے کا شے ہونا کافی نہیں ہوتا، بلکہ ان کا وجود کسی علت و سبب موجب کا محتاج ہوتا ہے پہلی قسم کی مثال یہ ہے کہ جیسے گرمی آگ کے لئے اور ٹھنڈک برف کے لئے ظاہر ہے کہ محض آگ کا آگ ہونا اور برف کا برف ہونا وجود حرارت و برودت کے لئے کافی ہے اس کے لئے کسی علت خارجی کی ضرورت نہیں یا مثلاً یہ کہ ہر مثلث کے تین زاویے اس کے دو قائموں کے برابر ہوتے ہیں یہ بالکل صاف ظاہر ہے کہ محض مثلث کا مثلث ہونا یعنی اس کی ہوتیت ہی اس کی اس صفت کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اس کے تینوں زوایا دونوں قائموں کے برابر ہیں۔

دوسری قسم کی صفات کی مثال یہ ہے کہ جیسے آگ کے قریب ہونے کی وجہ سے پانی میں حرارت کا یا برف ڈلنے سے اس میں برودت کا پیدا ہونا جو صفات کسی شے کے لئے لازماً ہوتی ہیں ان کو طبیعت اور خاصیت کہا جاتا ہے ان صفات کے حصول فی الذات کے لئے نفس ذات کے سوا نہ کوئی سبب خارجی ہوتا ہے اور نہ کوئی اور صفت ہی اس کے لئے سبب بنتی ہے افعال کا ذات سے جو صدور ہوتا ہے وہ انھیں طبائع اور خواص کے منطبق ہوتا ہے جو ذات کے لئے صفات اولیہ ذاتیہ کہلاتے ہیں۔

اس تمہید سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ کسی شے کے لئے جو صفات ذاتیہ ہوں گی وہ اس ذات کے ساتھ ساتھ پائی جائیں گی خواہ ان صفات کا اس ذات سے صدور ہوا ہو یا نہ ہو۔ مثلاً جو شخص سخی ہے جب تک وہ موجود ہے سخی کہلائے گا یا جو شخص بہادر ہے بہر حال وہ بہادر ہے خواہ اس سے اب تک شجاعت اور سخاوت کا عملاً صدور نہ ہوا ہو۔ کیونکہ سخی اور شجاع ہونے کے معنی میں کہ سخاوت اور شجاعت کے موقع پر یہ شخص سخاوت اور شجاعت کے جوہر دکھائیگا تو ہمارا یہ کہنا خود اس شخص کی

دلیل ہے کہ ہم نے صدورِ فعل سے پہلے ہی اس کو وصفِ شجاعت و سخاوت کے ساتھ متصف مان لیا ہے زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب تک کسی شخص سے ملکہِ سخاوت و شجاعت کا عملی اظہار و صدور نہ ہوگا۔ ہم اس کو کس طرح سخی یا شجاع کہہ سکتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی شے کے متعلق ہمارا عدم علم اس شے کے عدم کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ نے کسی فصیح و بلیغ مقرر و خطیب کی تقریر دیکھی ہے اب تک نہیں سنی ہے تو یہ کس طرح اس بات کی دلیل بن سکتا ہے کہ وہ مقرر و خطیب ہر سے فصیح و بلیغ ہی نہیں ہے۔ اس سے یہ نتیجہ صاف طور پر نکل آتا ہے کہ خدا میں جو صفات پائی جاتی ہیں اسکے وجود کیلئے تخلیقِ عالم کی ضرورت نہیں ہے۔ اس میں صفتِ خلق و رزق کا پایا جانا اس کا عظیم ہونا متکلم ہونا اور اس کا صفتِ سمع و بصر متصف ہونا اس پر موقوف نہیں ہے کہ اس کے بالمقابل کوئی شے مرزوق اور مخلوق وغیرہ بھی پائی جائے بلکہ وہ اپنی تمام صفات کمالیہ سے علیٰ وجہ التمام و الکمال اس وقت بھی متصف تھا جبکہ صرف وہ ہی وہ تھا اور اسکے علاوہ تمام چیزیں "دلہ ربك شیئاً مذکوراً" کے حجابِ غلیظ میں مستور تھیں۔ اب یہی بات کہ خدا میں کون کون سی صفات پائی جاتی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم جس ذاتِ گرامی کو خدا کہتے ہیں وہ تمام صفات کمالیہ کی مستجمع ہے اور اس کی واضح ترین دلیل یہ ہے کہ جس طرح ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے تبنی کا مشہور مصرعہ ہے۔

وبضدھا تبین الاشیاء

اسی طرح کسی چیز کا ناقص ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے بالمقابل کوئی اور کمال چیز پائی جا رہی ہے پھر یہ ظاہر ہے کہ کمال اور نقص دو قسم کے ہوتے ہیں ایک حقیقی اور دوسرا اضافی کمال حقیقی سے مراد یہ ہے کہ وہ سرتا پاکمال ہی کمال ہو اور اس میں ادنیٰ سا شائبہ نقص بھی نہ پایا جائے اسی طرح نقص حقیقی کے معنی یہ ہیں کہ وہ سرتا ناقص و غیر مکمل ہو اور اس میں کمال کی ہلکی سی آمیزش بھی نہ ہو ان دونوں کے درمیان نقص و کمال اضافی کا وجود ہوتا ہے جس کے مراتب بے شمار

نکلے ہیں پس جس طرح ہمارا وجود ناقص ایک کامل اورابدی وازلی وجود کا پتہ دے رہا ہے  
 اسی طرح ہماری صفات کمال کا نامکمل و ناقص ہونا اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ بالیقین کوئی  
 ذات گرامی ایسی موجود ہے جس میں یہ تمام صفات کمال کے مرتبہ قصویٰ کے ساتھ پائی جائیں اور  
 میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ ذات بجز اس کے کوئی اور نہیں ہے جو سرشتیہ وجود اور مبارک فیاض عالم پر  
 خدا کے لئے اثبات صفات کمالیہ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ انسان میں جو صفات کمالیہ  
 پائی جاتی ہیں وہ ظاہر ہے کہ انسان کے لئے اصلی اور ذاتی نہیں ہیں اور یہ ایک ناقابل انکار <sup>حقیقت</sup>  
 ہے کہ جو شے اصلی اور ذاتی نہیں ہوتی وہ کسی غیر کی معلول ہوتی ہے اس بنا پر لامحالہ ہماری تمام  
 صفات کمال کسی غیر کا معلول ہوں گی اور آخر کار یہ سلسلہ کسی ایسی ذات پر ختم ہوگا جو تمام اشیاء کی  
 علت تامہ و مطلقہ ہے اور خود وہ کسی کا معلول نہیں ورنہ پھر دور یا تسلسل لازم آئے گا اور چونکہ  
 یہ ذات گرامی صفت وجود میں آمل ہے۔ اس لئے اس کی ہر ہر صفت کمال بھی ایسی ہی آمل ہوگی۔  
 اب مذکورہ بالا تقریر کو اول سے آخر تک پھر ایک مرتبہ غور و خوض سے پڑھے تو یہ نتیجہ  
 بالکل یہی طور پر نکل آتا ہے کہ

(۱) خدا کی ذات مستجمع ہے تمام صفات کمالیہ کو

(۲) یہ تمام صفات اس کی ذات کے ساتھ قائم اور ازلی وابدی ہیں۔

صفات کی حقیقت | ہم خدا کی صفات کی نسبت صرف اتنا ہی جان سکتے ہیں اور جاننا چاہئے اس  
 سے متجاوز ہو کر اگر آپ یہ پوچھیں کہ ان صفات کی حقیقت کیا ہے اور ان کا قیام ذات باری کے  
 ساتھ کس نوعیت کا ہے تو ہم اس کے جواب میں صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہم صفات باری  
 کو اپنی صفات پر قیاس نہیں کر سکتے یعنی ہم جس طرح یہ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے بھی وجود ہے  
 اور خدا کے لئے بھی، لیکن با ایں ہمہ ہم پورے وثوق اور یقین سے جانتے ہیں کہ خدا کا وجود ہمارے

وجود کی طرح نہیں ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم کو یقین رکھنا چاہیے کہ خدا پر اور ہم پر صفاتِ کمال کے لفظی اطلاق کے باوجود ہماری ان صفات کو خدا کی صفات پر کسی طرح قیاس نہیں کیا جاسکتا۔  
یوں سمجھئے کہ خدا کو رحمان اور قہار کہا جاسکتا ہے اور وہ بے شبہ ان صفات کے ساتھ بدرجہ اتم موصوف ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اس کا رحم اور قہر ہمارے رحم اور قہر کے مانند نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ رحم اور قہر کے مفہوم میں تاثر و انفعال داخل ہیں یعنی ہم کسی پر رحم کرتے ہیں تو یہ نتیجہ ہوتا ہے ہمارے نفس کی رقت کا جو کسی قابل رحم چیز کو دیکھ کر ہمارے اوپر طاری ہو جاتی ہے اسی طرح قہر ہمارے نفس کے ہیجان و ثوران کا ثمرہ ہوتا ہے جو کسی ناگوار طبع چیز کے دیکھنے سے ہمارے احساس و شعور پر مستولی ہو کر قوتِ غضبی کو برانگیختہ کر دیتا ہے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ رحم اور قہر دونوں کی تعریف میں مبداء اور غایت کے لحاظ سے دو چیزیں شامل ہیں مبداء کے مرتبہ میں انفعال و تاثر ہے اور غایت کے درجہ میں فعل و تاثر اور چونکہ خدا کی ذات انفعال و تاثر سے منزہ ہے اس لئے اس کا رحم و قہار ہونا صرف غایت کے لحاظ سے ہے مبداء کے اعتبار سے نہیں یہ ایک اسیع واضح بات ہے کہ کسی سلیم الطبع انسان کو نہ اس کے انکار ہو سکتا ہے اور نہ کوئی شک و شبہ اسی پر خدا کی دوسری صفات مثلاً علم، ارادہ، مشیت، قدرت اور کلام کو قیاس کر لیجئے۔ ان کمالات کا اطلاق جن معالی سے ممکنات پر ہوتا ہے خدا پر نہیں ہو سکتا۔

اب اس امر کو تسلیم کرنے میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم خدا کی صفات کی نسبت صرف اتنا ہی جان سکتے ہیں کہ خدا میں یہ صفات پائی جاتی ہیں۔

دور بینانِ بارگاہِ است غیر ازیں پے نبرودہ اند کہ بہت

باقی رہا یہ سوال کہ کیونکر اور کس طرح تو ہم اس کی نسبت کچھ نہیں بتا سکتے کیونکہ کوئی چیز



ایسی موجود نہیں ہے جس پر ہم خدا کی ذات و صفات کو قیاس کر سکیں اس کے لئے نہ کوئی نذر  
 (مثل) ہے اور نہ ضد۔ اس نے خود فرمایا ہے "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" اکبر الہ آبادی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے  
 تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا بس جان گیا میں تری پہچان پہی،

پھر ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ خدا کی ذات و صفات کا کیا ذکر خود ہمارے اندر کتنی باطنی قوتیں اور  
 ملکات ہیں جن کو ہم ان کے آٹا سے پہچانتے ہی نہیں بلکہ ان کے وجود کا یقین رکھتے ہیں اور  
 اس کے باوجود ہم ان کی حقیقت و ماہیت سے بے خبر ہیں خود علم کو لیجئے بچپن سے اور جاہل سے جاہل  
 انسان بھی علم کی فضیلت اور برتری کا معترف ہے لیکن علم انسانی کی حقیقت کیا ہے وہ صورت حاصل  
 فی عقل ہے یا حصول صورت کا نام علم ہے یا خود قوتِ مدرکہ کو علم کہتے ہیں یا عالم اور معلوم کے  
 درمیان جو نسبتِ رابطہ ہے وہ علم ہے علم کے سلسلہ میں یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں  
 جن کا قطعی اور حتمی جواب آج تک نہیں دیا جاسکا، نفسِ ناطقہ انسانی کو سب یہ کہتے ہیں کہ وہ مسدود  
 اور اک ہے کلیات و جزئیات کے لئے عقل کو دنیا جانتی ہے کہ وہ انسان کے لئے سب سے بڑا  
 طغراء شرف و امتیاز ہے روح کے متعلق کس کو خبر نہیں کہ زندگی کا دار و مدار اس کے اتصالِ بحکم  
 پر موقوف ہے لیکن جب سوال کیا جاتا ہے کہ نفسِ ناطقہ کیا ہے عقل کی حقیقت و ماہیت کیا ہے  
 روح کی حد نام کیا ہے تو ان سوالات کے جواب میں فلاسفہ کے نظریات اس درجہ مختلف نظر  
 آتے ہیں کہ ان کی روشنی میں کسی ایک قطعی نتیجہ تک پہنچنا دشوار بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے پس جب  
 ان چیزوں کی نسبت ہمارا علم اس قدر محدود ہے تو پھر ظاہر ہے کہ خدا کی ذات و صفات کے  
 بارہ میں ہماری رسائی کہاں تک ہو سکتی ہے کسی نے سچ کہا ہے۔

تو براوجِ فلک چہ دانی چیت چوں ندانی کہ در سرانے تو کسیت

صفت ذات اور صفتِ فعل آپ پڑھ آئے ہیں کہ صفات دو قسم کی ہوتی ہیں ایک صفات ذات

جو ذات کے ساتھ قائم ہوتی ہیں اور دوسری وہ جذبات کے ساتھ قائم نہیں ہوتیں خدا کی صفات بھی  
دو قسم کی ہیں علامہ ابن تیمیہ ان کو صفتہ ذات اور صفت فعل سے تعبیر کرتے ہیں خدا کی صفات  
ذاتیہ کا تعلق اس کی ذات کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسے پھول کے ساتھ رنگ و بو آفتاب کے ساتھ  
حرارت اور روشنی پانی کے ساتھ برودت اور آگ کے ساتھ گرمی کا تعلق و قیام ہے یہی صفت  
فعل تو یہ وہ صفت ہے جو کسی معلول یا مفعول کے ساتھ تعلق کی وجہ سے خدا کے لئے حاصل ہوتی  
ہے مثلاً آگ کی ایک تو صفت حرارت ہے جو اس کے لئے ذاتی ہے جب آگ کا وجود ہوگا حرارت ضرور  
پائی جائے گی اور ایک صفت ہے جلانا تو ظاہر ہے کہ یہ صفت اس رابطہ پر دلالت کرتی ہے جو  
آگ کے اور کسی اور چیز کے درمیان پایا جاتا ہے اس پر ہی خدا کی صفت فعل کو قیاس کر لیجئے یعنی  
یہ صفت کسی خاص فعل کے اعتبار سے اس تعلق کو ظاہر کرتی ہے جو خدا اور اس کے بندہ کے درمیان  
ہوتا ہے اس صفت کی نسبت دو باتیں بالکل واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ صفت ذات  
کی طرح اس صفت کا موصوف بھی ذات ہی ہوگی کیونکہ جس طرح صفت ذات کا قیام و تعلق  
ذات کے ساتھ ہے اسی طرح اس صفت کا مبادر و مفعول بھی ذات ہی ہے دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ  
صفت فعل، صفت ذات کا ہی پر تو ہوتی ہے، لیکن چونکہ یہ صفت اس تعلق کی وجہ سے  
حاصل ہوتی ہے جو کسی دوسری شے کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے اس صفت کو ذات موصوف کے  
ساتھ وہ تعلق نہیں ہوتا جو صفت ذات کو ہوتا ہے اس بنا پر اس صفت کا ظہور جو مختلف اشکال  
و صورتوں میں ہوتا ہے اس کا اثر ذات پر کچھ نہیں ہوتا یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ صفت کی وجہ سے  
ذات موصوف میں کوئی تغیر پیدا ہو گیا ہے۔

تعدد صفات اور وحدانیت ذات | اس تقریر سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ خدا کے لئے متعدد صفات  
کا پایا جانا اس بات کو متکرم نہیں ہے کہ خود اس کی ذات میں بھی تعدد یا ترکیب پایا جائے کیونکہ

ہم مخلوقات میں دیکھتے ہیں کہ کثافت کے باوجود متعدد اشیاء کے اعتبار سے ایک شے کیلئے ہزاروں صفات والقباب ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک آدمی کسی کا باپ کسی کا بھائی، کسی کا خاندان کسی کا چچا اور کسی کا بھتیجہ کہلاتا ہے۔ ان تمام مختلف القاب کے باوجود یہ شخص شخص واحد ہی رہتا ہے اور اس کے ایک ہونے میں فرق نہیں پڑتا پس جب کثیف چیزوں کا یہ حال ہے تو ظاہر ہے خدا کی صفات کے تعدد سے اس کی ذات میں کس طرح تعدد پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ تو تمام موجودات سے زیادہ لطیف بلکہ حشرِ چہرہ لطافت ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہ نسبت کثیف کے لطیف میں تعدد و تکثر بہت کم ہوتا ہے اس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ وہی ایک ذاتِ خداوندی ہے جو کسی جہت سے خالق کسی وجہ سے رازق اور کسی لحاظ سے متکلم اور کسی اعتبار سے رحمن اور قہار و جبار ہے۔

اسی حقیقت کو ایک اور واضح تر مثال سے سمجھنے آفتاب کو طلوع کے وقت دیکھئے کتنا بڑا اور انگاروں کی طرح سرخ اور بے شعاع نظر آتا ہے پھر ملندہ ہو کر سفید دکھائی دیتا ہے اور مقدار میں چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب غروب ہونے لگتا ہے تو زرد بن جاتا ہے ان سب صورتوں میں یونہی کہتے ہیں کہ آفتاب کو دیکھا اب غور کیجئے کیا یہ تمام تغیرات ذاتِ آفتاب میں ہوتے ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ یہ زردی، سرخی، مقدار کا بڑا ہونا اور چھوٹا ہونا یہ سب ہماری نظر کے تاثرات و انفعالات ہیں جو آفتاب کے ایک خاص جہت میں نظر آنے اور اس کی شعاعوں کے زمین پر عمودی شکل میں یا ترچھے پڑنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں ورنہ آفتاب ان تمام حالات میں یکساں رہتا ہے اور اس کی مقدار میں نہ زیادتی ہوتی ہے اور نہ کمی پس جس طرح آفتاب ایک متعین رنگ رکھنے کے باوصف، مختلف الوان و صورتوں میں جلوہ نما ہوتا ہے اور طرح طرح سے تجلی کرتا ہے۔ ایسے ہی حضرت باری عز اسمہ ذاتِ واحد پر اس میں کسی قسم کا تعدد نہیں، لیکن باایں ہمہ تجلیات متعدد رکھتا ہے اور ان تجلیات سے کام صفات

کا نکلتا ہے۔

صفات کا ظہور حوادث میں | اس تقریر سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ خدا کی صفات کا ظہور حوادث کی شکل و صورت میں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ہم ان حوادث پر قیاس کر کے صفات کو حادث نہیں کہہ سکتے وہ بدستور قائم ہی رہیں گی اور اگر چہ تجلی کی صورت میں صفات کے لئے نبطا ہر تغیر و تبدل پایا جائے گا لیکن یہ محض نظر کا دھوکا ہو گا ورنہ دراصل وہ غیر متغیر و غیر متبدل ہیں مثال کے لئے ایک ایسی لائٹن کا تصور کیجئے جو ہر وقت پہلو ہوا اس کے چاروں طرف آٹھ مختلف رنگوں کے شیشے لگے ہوئے ہیں اور ان سب کے اندر ایک چراغ رکھا ہوا ہے اب دیکھئے چراغ کے لئے ایک روشنی تو وہ ہے جو چراغ کی ذات کے ساتھ قائم ہے یہ روشنی مطلق ہر کسی رنگ یا کسی مقدار کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک روشنی وہ ہے جو رنگین شیشوں کے عکس سے چھن چھن کر مختلف رنگوں کے ساتھ نظر آ رہی ہے ظاہر ہے کہ یہ دونوں روشنیاں چراغ کی ہیں کیونکہ سبز یا سرخ روشنی کو کوئی نہیں کہتا کہ یہ سبز یا سرخ شیشہ کی روشنی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ پہلی قسم کی روشنی (مطلق روشنی) ذاتِ چراغ کے ساتھ قائم ہے۔ کوئی شیشہ نہیں ہو گا۔ تب بھی یہ روشنی پائی جائے گی لیکن دوسری روشنی کے ظہور و قیام کا تعلق شیشہ کے ساتھ ہے۔ چنانچہ اگر آپ ان آٹھوں شیشوں میں سے کوئی شیشہ لائٹن سے نکال لیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس شیشہ کے رنگ کی روشنی بھی ایک بیک غائب ہو جاتی ہے اس مثال میں تین باتیں خاص طور پر لائق توجہ ہیں۔

(۱) جتنے مختلف رنگوں کی روشنیاں نظر آ رہی ہیں وہ سب شمع کی ہیں۔

(۲) شمع کی روشنی بذاتِ خود ان رنگوں میں سے کسی خاص رنگ کے ساتھ مقید نہیں لیکن

یہ واقعہ ہے کہ شمع کی روشنی کا مختلف رنگوں میں نظر آنا شیشوں کی وجہ سے ہی ہے۔

(۳) رنگ اور روشنی دونوں الگ دو چیزیں ہیں لیکن دونوں میں تعلق یہ ہے کہ روشنی ظاہر

ہے اور رنگ منظر یا دوسرے لفظوں میں یہ کہئے کہ روشنی متجلی ہے اور رنگ متجلی فیہ اور اس تعلق کے باعث دونوں میں ارتباط اس درجہ شدید ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا

اس میں خاص طور پر لحاظ کے قابل چیز یہ ہے کہ روشنی کا سرخ یا سبز ہونا شیشہ پر روشنی کا پرتو پڑنے

کی وجہ سے ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ روشنی کے لئے بذاتہ کوئی رنگ نہیں ہے لیکن اس

کے باوجود سرخی یا سبزی کی صفت ثابت ہوتی ہے روشنی کے لئے ہی نہ کہ شیشہ کیلئے کیونکہ یہاں

روشنی اور رنگ میں ذاتاً الگ الگ ہونے کے باوجود اس قدر زبردست اختلاط و ارتباط ہے

کہ گویا دونوں ایک ہی ہیں اور ان میں سے ایک کا قیام دوسرے کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا کہ

ذاتی کا قیام و تعلق موصوف کے ساتھ جن سطور پر خط کھینچا ہوا ہے ان کو بار بار پڑھئے اور غور

کیجئے تو آپ کو صفاتِ خداوندی کی تجلی اور حوادث کی شکل میں ان کے ظہور پر بڑی بصیرت

حاصل ہوگی اور بڑے بڑے خدشات و وساوس کا حل معلوم ہو جائے گا۔

مزید توضیح کی غرض سے ایک اور مثال نقل کرتا ہوں جس سے اصل مسئلہ پر زیادہ روشنی

پڑتی ہے آپ روزانہ دیکھتے ہیں کہ کسی ریڈیو اسٹیشن سے ایک تقریر نشر کی جاتی ہے اور آپ اسے

اپنے ریڈیوسٹ میں سنتے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ریڈیوسٹ میں ایک پیج لگا ہوا ہوتا ہے جس کو

انگریزی میں وولیم کنٹرول (Volume Control) کہتے ہیں اور جس سے آواز کو کم یا

زیادہ کرنے کا کام لیا جاتا ہے اب اس پر غور کیجئے کہ جہاں تک آواز کا تعلق ہے وہ بالکل یکساں ہی

یعنی مقرر ایک ہی آواز سے اول سے آخر تک اپنی تقریر کو پڑھتا چلا جاتا ہے اس میں نہ تیزی پیدا ہوتی

ہے اور نہ ہلکا پن لیکن ادھر حال یہ ہے کہ آپ اس پیج کو دو ایک چکر دیتے ہیں تو آواز ہلکی اور مدہم

نکلتی ہے اور اگر اس کو زیادہ گھماتے ہیں تو آواز بلند ہو جاتی ہے اب یہ ظاہر ہے کہ آواز کا ہلکا ہونا

یا تیز ہونا آواز کی ذاتیات میں داخل نہیں ہے اور آپ کے پیج گھمانے سے معترض کی اصل

آواز میں کوئی تغیر بھی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ہلکا پن یا تیزی صفت کس کی ہے؟  
 آواز کی ہی یا کسی اور چیز کی؟ ظاہر ہے کہ آواز ہی کی صفت ہے اور دلیل یہ ہے کہ آپ آواز کے  
 گھٹنے بڑھنے پر بے تکلف بول اٹھتے ہیں کہ آواز کم ہو گئی یا زیادہ ہو گئی۔

چونکہ صفات ایزدی کی تجلی کا مسئلہ نہایت دقیق ہے اور اس کی تشریح و توضیح فلسفیانہ  
 اصطلاحات کی روشنی میں بہت ہی مشکل ہے چنانچہ عربی نے کہا ہے۔

لور حیرت در شب اندیشہ اوصاف تو بس ہمایوں مرغ عقل از آسبیاں انداختہ

اور ہونا بھی یہی چاہیے بھلا ایک قطرہ بے مقدر کس طرح بحر ناپیدا کنار کو اپنی آغوش میں لے سکتا ہے؟

اس بنا پر اس حقیقت کے افہام و تفہیم کے لئے بہترین طریقہ مثالوں کا ہی ہو سکتا ہے ہم ذیل میں

ایک اور مثال کے ذریعہ اس کی تشریح کرتے ہیں آفتاب کی روشنی کو دیکھئے اس کے لئے کوئی خاص

مقدار یا شکل نہیں پائی جاتی لیکن اس کا گند ایسے روشن دان سے ہو جو مثلث یا مربع شکل کا ہے

تو خود آفتاب کی روشنی بھی اسی شکل سے منسلک ہو جاتی ہے اب عوز کیجئے روشنی اور یہ شکل دو مختلف

چیزیں ہیں لیکن صورت یہ ہے کہ روشنی کا گزر روشن دان میں سے ہو رہا ہے اور روشن دان ایک

خاص شکل رکھتا ہے۔ روشن دان میں سے گزرنے کی وجہ سے یا بالفاظ صحیح تر روشن دان کو اپنا

جلوہ گاہ بنانے کے باعث روشن دان کی شکل خاص خود روشنی کے لئے حاصل ہو گئی اور آپ اس

شکل کا حاصل و انصاف روشنی کے لئے ایسا ہی کرتے ہیں کہ گویا وہ روشنی کے لئے کوئی صفت ذاتی ہے؟

صفات لامین دلا غیر ہیں | مذکورہ بالا مثالوں پر عوز کرنے سے علم کلام کے ایک مشہور و معروف مسئلہ کا

بھی حل نکل آتا ہے یعنی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ صفات باری تعالیٰ کو ذات باری سے ایسی نسبت ہے

کہ نہ ان کو عین ذات کہہ سکتے ہیں اور نہ غیر ذات کیونکہ سرخی یا سبزی روشنی سے مثلث یا مربع شکل

آفتاب کی دھوپ سے کمی یا زیادتی آواز سے غیر بھی ہیں اور عین بھی۔ غیر اس اعتبار سے کہ یہ چیزیں

موصوف کی ذات کا عین نہیں ہیں۔ شمع کی روشنی پائی جاتی ہے اور سرخی یا سبزی کا وجود نہیں ہوتا۔ دھوپ کا وجود پایا جاتا ہے اور شکل مثلث یا مربع کا کہیں پتہ نہیں ہوتا اور عین اس بنا پر ہیں کہ شمع کی روشنی جب تک رنگین شیشوں کے درمیان محصور ہے اور آفتاب کی دھوپ جب تک مثلث یا مربع شکل کے روشن دان میں سے گزرتی ہے گی بہر حال شمع کی روشنی کے لئے رنگین اور دھوپ کے لئے مثلث یا مربع ہونا ضروری ہے اور ان دونوں میں سے کسی ایک کا انفکاک دوسرے سے نہیں ہو سکتا۔

حوادث کا قیام ذاتِ باری سے اس تقریر سے ایک اہم مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ بتکلمین عام طور سے کہتے ہیں کہ حوادث کا قیام ذاتِ باری کے ساتھ نہیں ہو سکتا یہ کہنے کی بنا پر خدا کی صفات فاعلی کے متعلق طرح طرح کے اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک کلام کے مسئلہ کو ہی لے لیجئے اگر یہ مطلقاً درست مان لیا جائے کہ ذاتِ باری کے ساتھ حوادث کا تعلق اور قیام ناجائز ہے تو اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر قرآن مجید کے الفاظ و حروف اور ان کی ترکیب و ترتیب جو یقیناً حادث ہیں ان کو خداوند تعالیٰ کی طرف کس طرح منسوب کر سکتے ہیں حالانکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن مع اپنے الفاظ کے خدا کا کلام ہے۔ جیسا کہ وانزلناہ قرائنا علیٰ نبیا وادراہی طرح کی متعدد تصریحات سے خود قرآن مجید سے ثابت ہے اس اعتراض سے بچنے کے لئے ہی تکلمین نے کلام نفسی اور کلام لفظی کا فرق کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ "القرآن کلام اللہ غیری مخلوق" جو کہا جاتا ہے تو وہ کلام نفسی کے اعتبار سے کہا جاتا ہے نہ کہ کلام لفظی کے لحاظ سے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی تفریق خود قرآن مجید کی نصوص کے خلاف ہے اور اس تفریق سے معتزلہ اور اشاعرہ کا اختلاف بھی محض ایک لفظی اختلاف ہو کر رہ جاتا ہے۔

لہ بزرگوں سے سنا ہے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی فرمایا کرتے تھے کہ اگر دعویٰ قرآن مجید بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱

غالباً اس عقدہ کی گرہ کشائی سب سے پہلے حافظ ابن تیمیہ نے کی ہے انہوں نے متعدد مواقع پر لکھا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ حوادث کا قیام ہو سکتا ہے اس مدعا کو ثابت کرنے کے لئے امام عالی مقام کے نزدیک ترتیب مقدمات یہ ہے۔

(۱) قرآن مجید سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کلام کیا۔

(۲) یہ کلام اور مخاطبت ازل میں نہیں تھی بلکہ حادث تھی۔

(۳) کلام کے لئے ضروری ہے کہ تکلم کے ساتھ قائم ہو۔

ان مقدمات کی ترتیب سے نتیجہ نکل آتا ہے کہ ذاتِ باری کے ساتھ حوادث کا قیام

ہو سکتا ہے حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں ہمارا یہ قول ایک ایسا قول ہے جس کی صحت پر شرع اور عقل

دالالت کرتے ہیں اور جو شخص یہ نہیں کہتا کہ خدا کلام کرتا ہے ارادہ کرتا ہے محبوب اور منجوس رکھتا

ہے راضی ہوتا ہے لانا ہے اور آتا ہے تو وہ اللہ کی کتاب سے مناقضہ کرتا ہے اور جو شخص یہ کہتا ہے

کہ اللہ نے حضرت موسیٰ کو ندا ازل میں دی تھی اور وہ برابر ندا دیتا رہا تو وہ عقل کی بات سے سرکشی کرنے

کے ساتھ ساتھ کلام اللہ کی بھی مخالفت کرتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

فَلَمَّا جَاءَهَا نُورٌ  
پس جب موسیٰ وہاں آئے تو انکو ندا دی گئی

رہیجئے اس میں ندا حضرت موسیٰ کی آمد سے وقت ہی اور ارشاد ہے۔

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ  
اللہ کا حکم یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا

يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ  
ہر تو اس کو کہتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے

(تفسیر حاشیہ صفحہ گذشتہ) میں کلام نفسی اور کلام لفظی کی تفریق ہوتی تو پھر امام احمد بن حنبل کو کیا ضرورت تھی کہ وہ کوڑے کھاتے

اور مصیبتیں اٹھاتے وہ کہہ سکتے تھے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ کلام نفسی کے اعمتبار سے ہے ورنہ کلام لفظی تو حادث

ہے ہی جیسا کہ متزلہ کہتے ہیں۔



اس آیت میں "اذا حروف شرط ہے جو استقبال پر دلالت کرتے ہیں ان آیتوں کے ثابت ہوتا ہے کہ اور متحدہ بھی اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہوتے ہیں۔

ایک تنبیہ | لیکن اس تقریب کے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ حافظ ابن تیمیہ قرآن مجید کے حروف کو مخلوق مانتے ہیں بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیزیں جن کو ہم حوادث سمجھتے ہیں وہ اگرچہ ہمارے اعتبار سے حوادث ہی ہیں لیکن جب ان کے ساتھ خدا کی کسی صفت کا تعلق ہو تو پھر ہمیں یقین کرنا چاہیے کہ وہ حوادث محض ہمارے اعتبار سے حوادث ہیں جن میں خدا کی کوئی صفت تجلی کر رہی ہے ورنہ درحقیقت وہ حوادث نہیں ہیں اب ذرا شمع کی مذکورہ بالا مثال کو سامنے رکھ کر غور کرو اور دیکھو کہ جب شمع کی روشنی کا عکس کسی رنگین شیشہ پر پڑتا ہے تو شیشہ کی رنگینی کی وجہ سے خود شمع کی روشنی بھی رنگین ہو جاتی ہے تو اگرچہ روشنی کا یہ رنگ شیشہ کے انعکاس کی وجہ سے ہی ہے، لیکن ہر دراصل شمع کی ہی روشنی اس لئے جو شمع کا حکم ہو گا وہی اس روشنی کا بھی ہو گا پس اسی طرح کلام کی بحث کو سامنے رکھ کر سمجھئے کہ قرآن کے وہ عربی الفاظ و حروف جن سے انسانی کلام مرکب ہوتا ہے بے شک و شبہ حادث ہیں لیکن جب یہی الفاظ و حروف خدا کی صفت کا منظر اور تجلی گاہ بن جاتے ہیں تو اب ہم ان کو اپنے کلام کے الفاظ و حروف پر قیاس کر کے مخلوق نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہ نے اسی مضمون میں ایک جگہ پر اس کی تصریح کر دی ہے فرماتے ہیں۔

"لیکن سلف کا قول یہ ہے کہ اللہ ہمیشہ سے متکلم ہے اور وہ جب چاہتا ہے کلام کرتا ہے اور کلام ایک صفت کمال ہے۔ کیونکہ جو شخص کلام کرتا ہے وہ نسبتاً اس سے اکل ہوتا ہے جو کلام نہیں کرتا اور یہ ظاہر ہے کہ کمال ان صفات کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے جو موصوف کے ساتھ قائم ہوں، اور مباحثہ عن الموصوف سے کمال کا تحقق نہیں ہوتا۔۔۔۔۔"

پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے صفات کمال کے ساتھ موصوف رہا ہے اور چونکہ ہم صفات کمال میں سے کلام ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کو ماننا پڑے گا کہ وہ تکلم ازلا وابداً ہے اور جب چاہتا ہے عربی میں کلام کرتا ہے جیسا کہ اس نے قرآن عربی کے ذریعہ کلام کیا پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ جن الفاظ و حروف کے ساتھ کلام کرے گا وہ اس کے ساتھ قائم ہوں گے نہ یہ کہ مخلوق و منفصل ہوں اس بنا پر وہ حروف جو اللہ کے اسماء حسنیٰ کے اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں کے مبانی ہونگے وہ مخلوق نہیں ہو سکتے کیونکہ اللہ نے ان سے تکلم کیا ہے ۱۰

کون نہیں جانتا کہ پانی اسی وقت پانی ہے جب تک کہ وہ دودھ کے ساتھ نہ ملا ہو لیکن دودھ میں مل جانے کے بعد کوئی اسے پانی نہیں کہتا بلکہ دودھ کہتے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ ایک اور موقع پر لکھتے ہیں۔

”اگر مستلزم للحوادث ممکن بنفسہ ہو یعنی وہ مفعول معلول اور مرلوب کہلائے تو ضروری ہے کہ وہ حادث ہو۔ لیکن اگر وہ واجب بنفسہ ہو تو ضروری نہیں کہ (استلزام للحوادث کی وجہ سے) وہ خود ممکن ہو جائے۔ یہی قول اہل الملل و اساطین الفلاسفہ کا ہے اور یہی قول جمہور اہل حدیث کا ہے ۱۱

عقیدۃ الطحاوی کے فاضل شایخ نے بھی اس مسئلہ پر کافی بحث کی ہے اور قریب قریب

۱۲ کتاب مذہب السلف التوفیق ص ۴۴، ۴۵ ۱۳ رسالہ صفۃ الکلام ص ۵۳

۱۴ شرح عقیدہ طحاوی کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے مطبع سلفیہ مصر کا مطبوعہ ہے اس شرح کے فاضل مصنف نے اپنا نام نہیں بتایا لیکن غالب قیاس یہ ہے کہ اس کے مصنف صدر الدین علی بن محمد بن العزلاذری المشقی الحنفی المتوفی ۷۴۶ھ ہیں جو علامہ ابن کثیر کے شاگرد ہیں اور صاحب کشف الظنون کے بیان کے مطابق افاضل علماء اخافین ہیں

وہی لکھا ہے جو حافظ ابن تیمیہ فرما چکے ہیں۔ ذیل میں ہم اس کا اقتباس درج کرتے ہیں۔

”اللہ تعالیٰ صفات کمال، صفات ذات اور صفات فعل دونوں کے ساتھ ہمیشہ سے متصف ہے اور ہمیشہ متصف رہے گا، کیونکہ خدا کی تمام صفات صفات کمال ہیں ان میں سے کسی ایک کا نہ ہونا صفت نقص ہے اور یہ بھی جائز نہیں ہے کہ اس کے لئے کوئی صفت کمال حاصل ہو، در اس حالیکہ وہ پہلے اس کی ضد کے ساتھ متصف رہ چکا ہو۔“

اس پر صفات فعل اور صفات اختیار یہ مثلاً خلق زردہ کرنا۔ مارنا قبض اور سبط غضب اور رضا کا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ اگرچہ ہم کو اس کی کثرت اور حقیقت معلوم نہیں ہے لیکن اصل معلوم ہے یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ امام مالک سے ثمر استوی علی العرش کی تفسیر پوچھی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ استواء معلوم ہے لیکن کیف مجہول ہے ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ احوال ایک وقت میں نہیں ہوتے اور کسی دوسرے وقت میں حادث ہو جاتے ہیں لیکن احوال و افعال کا یہ حدوث ذات خداوندی کے اعتبار سے متنع نہیں ہے اور اس پر اس بات کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا کہ وہ عدم کے بعد حادث ہو گئے ہیں تم جانتے ہو کہ جو شخص کلام کرنے کی قدرت رکھتا ہو اور وہ آج تمہارے سامنے کلام کرے تو تم یہ نہیں کہتے کہ حدث لہ الکلام کلام اس کے لئے حادث ہو گیا ہے البتہ ہاں اگر کوئی شخص گونگا ہو کلام کی بالکل قدرت نہ رکھتا ہو اور وہ کسی دن کلام کرنے لگے تو اسکی نسبت یہ کہا جائے گا کہ حدث لہ الکلام جو شخص بغیر کسی آفت سماوی کے خاموش ہو وہ خوشی کے وقت بھی متکلم بالقوہ ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جب چاہے کلام کر سکتا ہے پھر جب کلام کرتا ہے تو متکلم بالفعل ہو جاتا ہے۔ پس جس طرح متکلم بالقوہ بالفعل

کلام نہ کرنے سے یا کوئی کاتب بالقوة بالفضل کتابت نہ کرنے سے کسی صفت ذمکم اور کتابت کی ضد سے متصف نہیں ہوتا۔ اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ افعال اختیار یہ کا اصطلاحی حدوث باری تعالیٰ کے لئے موجب نقص نہیں ہے۔

اس کے بعد عقیدہ طحاوی کے فاضل شارح لکھتے ہیں :-

اور علم کلام میں یہ جو کہا جاتا ہے کہ خدا میں حوادث کا حلول نہیں ہو سکتا تو یہ ایک قول مجمل ہے اس کا ذکر نہ کہیں قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر نفی سے مراد یہ ہے کہ خدا کی مقدس ذات میں اس کی محدث مخلوقات میں سے کسی محدث کا نزول اور اس کے لئے کسی وصف مجدد کا حدوث نہیں ہو سکتا تو بے شبہ اس اعتبار سے یہ کہنا... کہ خدا میں حلولِ حوادث ممتنع ہے صحیح ہے لیکن اگر اس قول سے مراد یہ ہے کہ خدا سے صفات اختیار یہ کی نفی کر دی جائے اور یہ کہا جائے کہ خدا اپنے ارادہ اور مشیت کے مطابق فعل نہیں کر سکتا اور نہ وہ جب چاہے اور جس طرح چاہے کلام کر سکتا ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ اس اعتبار سے یہ کہنا کہ خدا میں حلولِ حوادث نہیں ہو سکتا بالکل غلط اور باطل ہے۔

بڑی شکل یہ ہے کہ اہل کلام نفی حلولِ حوادث کے الفاظ بہت ہی مبہم طریقہ پر بولتے ہیں راسخ العقیدہ مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کہہ کر خداوند تعالیٰ سے ان چیزوں کی نفی کی جا رہی ہے جو اس کی ذات متجمع الصفات کے ثبوت میں ہیں۔ جب راسخ العقیدہ مسلمان اس کو تسلیم کر لیتا ہے تو پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ نفی حلولِ حوادث سے مراد تو یہ تھی کہ خدا سے صفات اختیار یہ اور صفات فعل دونوں کی نفی کر دی جائے۔

کلام الہی یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے، خدا کی عام صفات کے متعلق تھا، لہذا کلام الہی کا بھی تذکرہ آ گیا ہے۔ اب اس پوری تقریر کو سامنے رکھ کر غور کر کیجئے، تو چند نتائج بین طور پر پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) خدا تمام صفات کمال کے ساتھ متصف ہے جن میں سے ایک صفت کلام بھی ہے۔

(۲) خدا کی صفات دو قسم کی ہیں ایک صفات ذات اور دوسری صفات فعلی یا فاعلی۔

(۳) صفات فعلی کا ظہور حوادث کی شکل میں ہوتا ہے۔ یعنی حوادث ان کا منظر بنتے ہیں

(۴) لیکن ان حوادث کو ہم اپنے حوادث پر قیاس نہیں کر سکتے بلکہ صفات فعلی کے ساتھ

گہرے ربط کی وجہ سے ان کا حال بھی وہی ہوتا ہے جو صفات فعلی کا ہوتا ہے۔

اب ان صفات پر کلام کی صفت ربانی کو بھی قیاس کیجئے تو اس بات کے ثابت ہونے

میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا کہ خدا کی صفت کلام بھی دو طرح کی ہے ایک صفت ذات جو ذات

خداوندی کے ساتھ قائم ہے۔ اور جس کے اعتبار سے وہ اس وقت بھی منکلم تھا جب کہ اس کے

سوا کسی اور چیز کا کہیں وجود نہیں تھا دوسری صفت۔ صفت فعل ہے یہ وہ صفت ہے جس کی

وجہ سے خدا کا کلام مختلف زبانوں میں مختلف انبیاء پر نازل ہوتا رہا اور آخر امر عربی زبان میں محمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔

قرآن مع الفاظ کے کلام الہی ہے | فریق باطلہ کو چھوڑ کر بعض علماء حق تک نے کہا ہے کہ خدا کی صفت

کلام معنی واحد ہے اور اس میں تعدد و کثرت بجزی اور تبصص مدلول (یعنی معنی و مفہوم) کے لحاظ

نہیں ہے بلکہ دلالت کے اعتبار سے ہے اور یہ عبارتیں مخلوق ہیں لیکن ان کو جو کلام اللہ کہا جاتا

ہے وہ اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ یہ عبارتیں مدلول پر دلالت کرتی ہیں۔ اگر اس مفہوم کو عربی زبان

میں ادا کیا جائے تو وہ قرآن ہے اور اگر عبرانی زبان میں ادا کیا جائے تو وہ توراہ ہے۔ عربی میں

مختلف ہیں لیکن کلام مختلف نہیں ہے ابن کلاب اور ابو الحسن اشعری وغیرہ کا یہی قول ہے لیکن

امہ سلف صالحین کا فیصلہ اس کے خلاف ہے وہ قرآن مجید کو مع الفاظ و معانی کے غیر مخلوق مانتے ہیں اور اوپر جو تقریر گزر چکی ہے اس کی روشنی میں اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ سلف صالحین کے فیصلہ کو صحیح تسلیم کرنے میں کوئی عقلی استحالہ یا استبعاد بالکل نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ کلام خدا کی صفت ازلی و ابدی ہے اور اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے لیکن یہ بھی بے شبہ درست ہے کہ اس صفت کا ظہور بروز مختلف شکلوں اور صورتوں میں ہوتا رہا ہے اور یہ اشکال و صورت کا اختلاف اصل صفت کلام میں نہیں ہوتا بلکہ ان انبیاء کی وجہ سے ہوتا ہے جو مختلف زبانیں رکھتے تھے اور جن پر کلام الہی کا نزول ہوتا تھا۔ پس اگرچہ یہ اختلاف اشکال و صورت اصل کلام میں نہیں ہے تاہم مخاطبین کے مختلف احوال و مزاج کے باعث اصل صفت جن مختلف مظاہر میں نظر آ رہی ہے وہ سب مظاہر بھی خدا کی ہی طرف منسوب ہوں گے۔ اور شدت ارتباط کے باعث ان کا حکم بھی وہی ہو گا جو تجلی کا ہے ایک مرتبہ پھر اسی شمع والی مثال کو سامنے رکھ کر غور کرو کہ چراغ کی اصل روشنی کی طرح خدا کی صفت کلام بھی مقید اور مطلق ہے لیکن جب طرح اس روشنی کا عکس کسی رنگین شیشہ پر پڑتا ہے تو خود چراغ کی روشنی کا بھی اسی رنگ میں نظر آنا شیشہ کے انعکاس کے باعث ہی ہوتا ہے لیکن پھر بھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ شیشہ کی روشنی رنگین ہے بلکہ وہ رنگین روشنی بھی شمع کی ہی کہلاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح یقین کرو کہ کلام الہی کی شمع جانفروز بغیر کسی رنگ تقید و تعین کے اپنی شان اطلاق کے ساتھ ازلا و ابداً روشن و تابناک ہے۔ لیکن حضرت موسیٰ کے قلب مطہر کا شیشہ اس نوزیم نزل سے منعکس ہوا تو اسی شمع کلام الہی کا جلوہ عبرانی شکل میں نظر آیا۔ حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ کے پاک و صاف دلوں کے آئینے اس روشنی سے عکس پذیر ہوئے۔ تو لوگوں کو اس شمع کی روشنی زبور اور انجیل کی صورت میں آئی پھر سب آخر میں اس شمع کا نور عرب کے ایک قلب آئینہ شمال پر اس کی بساط

و مقدرات کے مطابق پرتو نکلن ہوا تو اس نور کا ظہور عربی زبان میں ہوا اور قرآن مجید کہلایا پھر جس طرح مطلق روشنی اور رنگین روشنی دونوں شمع کی ہلیں اور آپ رنگ کو روشنی سے جدا نہیں کر سکتے اسی طرح مطلق کلام اور کلام بزبان عربی قرآن، دونوں خدا کے ہلیں اور آپ قرآن کے عربی الفاظ و حروف کو کلام الہی سے خارج قرار نہیں دے سکتے۔ فافہم و تتدبّر

عجبات ہے کہ خود قرآن مجید نے نور الہی کو اسی تمثیل سے بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ مِثْلُ  
نُورِهِ كَمِثْلَةِ شِعْءٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ  
فِي زُجَاجَةٍ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ  
دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُبَارَكَةٍ  
زَيْتُونَةٍ شَرْقِيَّةٍ وَأُخْرَى بَيْتِي  
سَيَّكَادُ زَيْتُونَتَانِ فِي مَدْيَنَ  
نُورِ عَلِيٍّ نُورِ كَهْدِي اللَّهُ لَمُوسَى  
مَنْ يَشَاءُ وَيُضِيبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ  
لِلنَّاسِ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ

(النور)

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اس کے نور کی مثال اس طاق کی سی ہے جس میں چراغ ہو اور چراغ ایک شیشہ میں ہو شیشہ ایسا چمکتا ہو کہ گویا وہ روشن ستارہ ہے یہ چراغ ایک مبارک درخت زیتون کے تیل سے روشن کیا گیا ہو اس درخت کی نسبت نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ مغرب کی طرف، تیل ایسا صاف و شفاف ہو کہ وہ آگ کو چھوئے بغیر روشن ہو جائے اللہ نور علی نور ہے وہ جس کو چاہتا ہے اپنے نور کی ہدایت کرتا ہے اللہ یہ مثال لوگوں کے لئے

بیان کرتا ہے اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے

حضرت مجدد الف ثانی نے معانی اور الفاظ کو لباس اور طبوس سے تشبیہ دی ہے اور

دونوں کو خدا کی طرف منسوب کیا ہے فرماتے ہیں۔

”قرآن کلام خداست جل سلطانہ کہ بہ لباس حرف و صوت در آورده بر بنجیر باعلیہ و علی

آلاء الصلوٰۃ والسلام منزل ساختہ وعباد را یہ آں امر و نہی فرمودہ چنانچہ ما کلام نفسی خود را بہ توسط کلام  
 در زبان در لباس حروف و صوت در آورده ظاہری سازیم و مقاصد خفیہ خود را در عرصہ ظہوری آیدیم  
 ہمچنین حضرت حق سبحانہ کلام نفسی خود را بے توسط کلام در زبان بہ قدرت کاملہ خود لباس حروف  
 و صوت عطا فرمودہ بر عباد فرستادہ است و ادامہ و ذرا ہی خفیہ خود را در ضمن حروف و صوت  
 آورده بر منصفہ جلوہ دادہ است ۱

جو لوگ قرآن مجید کو صرف معانی کے اعتبار سے وحی مانتے ہیں اور الفاظ کی نسبت  
 خدا کی طرف نہیں کرتے ان کو غور کرنا چاہیے کہ قرآن مجید کی تصریحات سے قطع نظر یہ ایک بالکل  
 واضح امر ہے کہ قلب میں محض معانی کے انعقاد کے کوئی معنی ہی نہیں جس طرح معانی کا اظہار  
 بغیر الفاظ کے نہیں ہوتا۔ اسی طرح قلب میں ان کا ظہور اور پھر ان کا تشخص و تعین بھی الفاظ  
 کے بغیر ناممکن ہے چنانچہ ڈاکٹر محمد اقبال اپنی تصنیف "اسلام میں مذہبی خیال کی تعمیر نو"  
 (Reconstruction of religious thought in Islam) میں لکھتے ہیں

”جدید علم النفس نے حال ہی میں متصوفاۃ شعور و کیفیت کی حقیقت کی طرف توجہ کی ہے اس بلا  
 واسطہ شعور و آگہی کے ذریعہ سالک خدا کو اسی طرح جانتا ہے جس طرح ہم عام چیزوں کو دیکھ کر یا یہ  
 شعور و احساس ناقابل تجزیہ ہے اور کسی خارجی وجود کے عکس پر تو کا نتیجہ ہے اس شعور و  
 احساس کی کیفیت کسی دوسرے کے لئے بیان کرنی بھی مشکل ہے۔“

ذوقِ این بادہ ندانی بخند آنا بخشی

پہنمبر کا یہ احساس، فہم و ادراک کا عنصر بھی رکھتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ پہنمبر کا  
 یہ احساس خیال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے احساس کی خصوصیت ہی یہ ہے  
 کہ وہ الفاظ کا جامہ پہن کر زبانِ نبوت پر جاری ہوتا ہے احساس دراصل ایک خارجی چیز



(outward pushing) کا لقب پر وارد ہونا اور خیال اس کے اظہار  
 (outward Rohorting) کا ذریعہ ہے عین لفظی اور گونگا احساس اپنے نشا کو خیال  
 کی صورت میں ادا کرتا ہے اور خیال الفاظ کا جامہ پہن کر ظاہر ہوتا ہے گویا یہ کہنا محض استعارہ  
 نہیں ہے کہ خیال اور لفظ دونوں بیک وقت رحم احساس سے پیدا ہوتے ہیں بلکہ حقیقت  
 یہ ہے کہ خیال الفاظ سے محرک نہیں ہوتا۔ اپنی ابتدا اور آفرینش کے لحاظ سے دونوں مساوی  
 درجہ رکھتے ہیں۔ گویا لفظ بھی ملہم ہے۔ مختصر یہ ہے کہ قرآن لفظاً و معنیاً کلام الہی ہے۔

روزمرہ کی زندگی میں دیکھئے آپ کسی اچھے اور میا ختمہ شعر کو سن کر کہتے ہیں یہ تو  
 الہامی شعر ہے اب بتائیے کہ کیا اس جملہ سے آپ کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس شعر کے صرف  
 معانی الہامی ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ حق یہ ہے کہ معانی کتنے ہی عمدہ اور بلند ہوں اگر الفاظ  
 کا جامہ ان پر چیت نہیں ہے تو آپ کبھی اس شعر کو الہامی کہہ ہی نہیں سکتے۔

کیا کلام کیلئے نطق ضروری ہے | بعض نادان پوچھتے ہیں کہ اچھا خدا کلام کرتا ہے تو اس کے  
 لئے نطق بھی ہو گا حالانکہ نطق اعصاب و عضلات کی مخصوص حرکت کا نام ہے اور یہ حرکت  
 ذات بسیط و مجرد کے لئے نہیں ہو سکتی " جواب یہ ہے کہ اول تو اس شبہ کا جواب  
 پہلے ہی گزر چکا ہے یعنی یہ کہ ہم خدا کی کسی صفت کو اپنی صفت پر قیاس نہیں کر سکتے  
 جس طرح ہمارا ایمان ہے کہ خدا دیکھتا ہے اور سنتا ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس کے دیکھنے  
 اور سننے کی صورت اور حقیقت کیا ہے؟

اسی طرح ہم کو بہ طریق اذعان و یقین معلوم ہے کہ خدا کلام کرتا ہے۔ لیکن یہ  
 نہیں بتا سکتے کہ اس کلام کی نوعیت کیا ہے؟

علاوہ ازیں اس کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ کلام کے لئے نطق کی ایسی کوئی

ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ کسی کا کلام وہ ہے جس سے اس کے مافی الضمیر کا اظہار ہو اور یہ اظہار جس طرح زبان کے ذریعہ ہوتا ہے ہاتھ کے یا کسی اور عضو کے اشارہ سے اور اس کے علاوہ مختلف طریقوں سے بھی ہوتا ہے فرض کیجئے ایک شاعر اپنی زبان سے ایک حرف نہ کہے اور وہ پوری ایک غزل صفحہ قرطاس پر لکھ کر ہمیں دیدے تو کیا ہم اس غزل کو اس بنا پر شاعر کا کلام نہیں کہیں گے کہ اس نے اس غزل کے الفاظ و حروف کا نطق کیا ہی نہیں ہے۔

کون نہیں جانتا کہ فوجوں میں جمنڈیوں شیشوں اور اشاروں سے گفتگو کی جاتی ہے اور انھیں ذرائع سے خبریں پہنچائی جاتی ہیں۔ اسٹیشنوں پر بازاروں میں اور ٹریفک کے موقعوں پر سبز اور سرخ روشنیوں سے الفاظ و حروف کا کام لیا جاتا ہے انسان جب تک الفاظ و حروف سے آشنا نہیں ہوا تھا وہ گفتگو کے وقت ہاتھ اور آنکھ کے اشاروں سے مافی الضمیر کا اظہار کرتا تھا۔ ظاہر ہے یہ تمام علامات و اشارات معانی پر دلالت کرنے کے باوصف غیر ملفوظ و غیر منطوق ہیں لیکن اگر ان معانی کو کسی دوسرے تک منتقل کیا جائے تو پھر یہ معانی الفاظ و حروف کا جامہ پہن لیں گے تاہم ان کی نسبت اس شخص کی ہی طرف ہوگی جس نے بولے بغیر کسی علامت کے ذریعہ آپ کو وہ معانی بتائے اس سے بھی زیادہ دلچسپ اور واضح مثال یہ ہے کہ تار گھر میں آپ نے دیکھا ہوگا تار بالو ایک آلہ جس کو انگریزی میں ڈمی (Dummy) کہتے ہیں اس کے پاس بیٹھ کر انگلیوں کی حرکت سے اس آلہ کو جنبش دیتا ہے اس کی اس جنبش سے کسی دوسرے شہر میں تار و صول کرنے والا بالو محض گرگٹ گرگٹ کی آواز سنتا ہے اور تار کا تمام مضمون معلوم کر لیتا ہے پھر جب وہ اس مضمون کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرتا ہے تو مسلسل ایک بامعنی عبارت یا جملہ بن جاتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی دیکھئے کہ گرگٹ گرگٹ کی آواز کے ذریعہ تار کا مضمون

صحیح صحیح معلوم کر لینا تا وصول کرانے والے (Receiver) بابو کی لیاقت و قابلیت پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر یہ قابل ہے تو وہ مضمون کا ایک ایک حرف ہی وصول نہیں کرتا بلکہ عبارت کا کلام اور ڈسین تک صحیح صحیح وصول کر لیتا ہے پس یہی حال انبیا اور رسل کا ہے ذات حق میں اور ان میں ایک خاص قسم کا معنوی تعلق ہونے کے باعث ان میں اس بات کی صلاحیت بدرجہ اتم ہوتی ہے کہ مبادیہ فیاض کی جانب سے جن معانی و مطالب کا فیضان ایک خاص طریقہ پر ان کے نفوسِ طاہرہ پر ہو وہ انھیں پورے طور پر سمجھ لیں اور چونکہ کسی معنی کا دل میں خطو ریخیر الفاظ کے نہیں ہوتا اس لئے انبیا کرام جب ان معانی کو سمجھتے ہیں تو اس حالت میں سمجھتے ہیں کہ وہ معانی و الفاظ ساتھ تکلیف اور ان کے جامہ میں ملبوس ہوتے ہیں۔ معانی اور الفاظ میں ایسا گہرا تعلق ہے کہ ان میں زمانہ کے اعتبار سے کوئی تقدم و تاخر نہیں ہوتا بلکہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ جس آن معانی کا انقاد ہو رہا ہے۔ ٹھیک اسی آن میں الفاظ بھی منجانب اللہ نازل ہو رہے ہیں اور ان الفاظ کا ملہم بھی وہی ہے جس نے معانی کا انقاد قلب میں کیا ہے اب دیکھئے یہاں الفاظ اور معانی دونوں کلام الہی کی صورت میں نبی کے قلب پر نازل ہو رہے ہیں اور پھر پائے نطق درمیان میں نہیں ہر دو اعترافہ فیہ زبان حال کی دست گویائی استدلال کے لئے نہیں بلکہ تماماً للہجہ و مقسلف کلام کا بغیر نطق کے تصور بھی نہیں کر سکتے اس موقع پر ان سے یہ دریافت کرنا غالباً بے محل نہیں ہوگا کہ کیا آپ نے کبھی یہ نہیں سنا کہ بعض مرتبہ زبان حال سے دل کی بات ایسے بلخ پیرا میں بیان ہو جاتی ہے کہ زبان قال سے نہیں ہوتی عربی کا ایک شاعر کہتا ہے

دلیل حین یلقا  
سین مقائیس و اشباہ  
ع ان تنطق احوالہ

ومقلب علی القلب  
وقی النامین من النام  
وقی العین عنی للہم

۱۵ ترجمہ: اور دل جب دل کو ملتا ہو تو اس کے لئے ایک دوسرے پر دلالت کر یو لایا ہوتا ہو تو آہوں میں ایک دوسرے کے مسائل اور مشابہ ہوتے ہیں اور آٹھ اس طرح کلام کرتی ہے کہ منہ کو بولنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

ایک اور شاعر نے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں کہا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس نے زبانِ چشم کی گویائی کو وحی سے تعبیر کیا ہے۔

تري عينها عيني فتعرف وجهها  
وتعرف عيني ما بينا لوحى جج له

ایک شاعر آنکھ کے ذریعہ کسی مانی بضمیر کو اپنے مخاطب پر ظاہر کر دینے کو آنکھ کا نطق بتاتا ہے۔

العين تبدي الذي في نفسها  
من المحبة او بغض اذا كانا

والعين تنطق والا فواضا  
حتى ترى من ضمير القلب تبديانا

ترجمہ:- آنکھ خواہ محبت ہو یا بغض بہر حال اس چیز کو ظاہر کر دیتی ہے جو کسی شخص کے دل میں ہوتی ہے اور آنکھ گویا ہوتی ہے در اس حالیکہ منہ خاموش ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ آنکھ دل کی چھپی ہوئی بات کو صاف صاف دیکھ لیتی ہے۔

کتاب عقائد کا ایک مشہور عربی شعر ہے جو کلامِ نفسی کی بحث میں نقل کرتے ہیں

انّ الكلام لفي الفؤاد وانشاء  
جعل اللسان على الفؤاد دليلاً

ترجمہ:- کلام تو دراصل دل میں ہوتا ہے زبان تو صرف ظاہر کر دینے والی ہے۔

قرآن مجید میں خدا کی صفت کلام کا ذکر یہاں تک جو بحث تھی محض عقلی تھی ضمناً کہیں کہیں مدعا کی تائید و تقویت کے لئے آیتوں کے حوالے آگئے ہیں۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید میں خدا کی صفت کلام کی نسبت کیا کچھ تصریحات ہیں

لہ ترجمہ:- اس محسوس کی آنکھ میری آنکھ کو دکھتی ہے اور اس کی وحی پہچان جاتی ہے پھر محبوب کی آنکھ اس وحی کا جواب دیتی ہے تو میری آنکھ اُسے پہچان جاتی ہے۔

تاکہ آپ انہیں تنقیحاتِ عقلی پر منطبق کر سکیں۔

کلامِ صفتِ کمال ہے | حضرت موسیٰ کے واقعہ میں سامری کے بچھڑے کا جو نقص بتایا گیا ہے

اس میں اس کا بھی ذکر ہے کہ وہ کلام نہیں کر سکتا تھا۔ ارشاد ہے۔

وَإِخْتَدَّ قَوْمٌ مِّنْ مُّوسَىٰ مِنْ بَعْدِهِ مِّنْ  
حِلْيَتِهِمْ عَجَلًا جَسَدًا آلَهُ خَوَّارًا  
يَرَوْنَ أَنَّهُمْ لَا يَكْلَمُهُمْ وَلَا يَهْتَمُّ  
سَبِيلًا

موسیٰ کے بعد ان کی قوم نے اپنے زیوروں  
سے ایک بچھڑے کا دھڑ بنایا جو گائے کی سی  
آواز نکالتا تھا کیا ان لوگوں نے یہ نہیں دیکھا کہ  
یہ بچھڑہ نہ ان سے کلام کر سکتا ہے اور نہ کسی راستہ  
کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے۔

پھر اسی بچھڑے کی نسبت اسی سورۃ میں ارشاد ہے۔

أَفَلَا يَرَوْنَ إِلَّا يَمِيزُ الْيَهُودَ قَوْلًا  
وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا

کیا وہ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ بچھڑا نہ ان کی کسی  
بات کا جواب دے سکتا ہے اور نہ وہ ان کے  
ضرر و نفع کا مالک ہے۔

سامری بچھڑے کو خدا بتاتا تھا۔ قرآن اس کی تردید کرتا ہے اور بچھڑے کی عدم الوہیت  
کی دلیل یہ بیان کرتا ہے کہ وہ تو کلام بھی نہیں کر سکتا تھا اس سے معلوم ہوا کہ خدا کے لئے  
شکلم ہونا ضروری ہے۔

خدا کلام کرتا ہے | چنانچہ حُرّانے متعدد مواقع پر قرآن میں اپنے کلام کرنے کا ذکر کیا ہے  
حضرت موسیٰ کے واقعہ میں ذکر ہے۔

وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ  
رَبُّنَا

اور جب موسیٰ ہمارے مقررہ وقت پر حاضری  
دینے کیلئے آیا اور اس کے رب نے ان سے کلام کیا

(اعراف)

پھر حضرت موسیٰ کو جو شریف ہم کلامی عطا فرمایا گیا تھا اس کا ذکر اس طرح ہے۔

يٰمُوسَىٰ اِنِّى اصْطَفَيْتَكَ عَلٰى

اے موسیٰ میں نے تجھ کو اپنی پیغمبری اور ہم کلامی

النَّاسِ بِرِسَالَتِيْ وَبِكَلَامِيْ  
سے لوگوں پر برگزیدگی بخشی۔

کسی کو خیال ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے اللہ نے سچ مچ کلام نہ کیا ہو اور کلام کی اسناد اللہ کی طرف مجازاً ہو۔ اس شبہ کا ازالہ بھی کر دیا گیا۔ فرماتے ہیں۔

وَكَوَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِیْمًا  
اور اللہ نے موسیٰ سے یقیناً کلام کیا ہے۔

زبان عربی کے رمز شناس جانتے ہیں کہ مصدر سے فعل کی تاکید بیان کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ فاعل سے فعل کا صدور ضرور ہوا ہے۔

ان آیتوں کے علاوہ کسی آیتوں میں اہل جنت سے کلام کرنے کا اور بے ایمان لوگوں سے کلام نہ کرنے کا بھی ذکر ہے مثلاً اہل جنت کے باب میں ہے۔

سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبِّ رَحِیْمٍ  
سلامتی ہو یہ رب رحیم کی طرف سے کہا گیا ہو

بے ایمانوں کے بارہ میں کہا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ  
جن لوگوں نے اللہ کے وعدہ اور اپنی قسموں کو

وَ اٰیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِكَ  
تھوڑی سی قیمت میں بیچ دیا ہے ان کے لئے

اٰخِرَتِمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا  
آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہو اور اللہ شان سے

یَنْظُرُھُمْ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْھُمْ  
کلام کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا۔

خدا اپنی شان کے مطابق کلام کرتا ہے | صفت کلام کے اثبات کے ساتھ ساتھ قرآن کے انداز

بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے کلام کی حقیقت وہ نہیں ہے جو ہمارے کلام کی ہے بلکہ اسکا

کلام اس کی شان اور ہیبت کے مطابق ہوگا اگرچہ قرآن نے اس مضمون کی تصریح نہیں کی لیکن اس

مختلف چیزوں کیلئے جو کلام کا لفظ بولا ہے اس سے اس مدعا پر روشنی پڑتی ہے قیامت کے دن انسان کے دست و پا اس کے اعمال و افعال پر جو شہادت دیں گے ان کے ذکر میں ہے۔

الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيَهُمْ وَنَشْهَدُ أَرْجُلَهُمْ  
 آج کے دن ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور ان کے پیر شہادت دیں گے۔ (کیس)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ کلام کریں گے اور پیر شہادت دیں گے لیکن کس طرح اس کی حقیقت نامعلوم ہے اسی طرح کھالوں کے متعلق ارشاد ہے۔

وَقَالُوا الْحَلُودُ هُمْ لَمْ يَشْهَدُوا  
 اور یہ لوگ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف شہادت کس طرح دی تو وہ  
 عَلَيْنَا قَالُوا اتَّظَنَّا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي  
 کھالیں جو اب بیٹگی کہ ہم کو اس خدا نے گواہ کر دیا  
 انطق كل شئ

ہے جس نے ہر چیز کو گواہ کیا ہے۔

اب دیکھئے اس آیت میں جلوہ کے لئے نطق ثابت کیا گیا ہے لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ نطق کس طرح کا ہے؟ تو اس کے جواب میں بجز اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس کی حقیقت کا علم صرف خدا کو ہی ہے وہ سرگشتہ نطق حدوث و امکان انسان جس کا علم و ما اودیتتم من العلم الا قليلا کے دائرہ میں محدود ہے علم کی ان پہنائیوں تک رسائی کا دعویٰ اس طرح کر سکتا ہے بس اس سے سمجھ لو کہ خدا کا کلام اس کی شان کے مطابق ہو گا ہم اس کی حقیقت کس طرح متعین کر سکتے ہیں۔

خدا نذکرنا ہے | البتہ قرآن ہے اتنی بائب اور ثابت ہے کہ خدا کے لئے نذ بھی پائی جاتی ہے

حضرت موسیٰ کے واقعہ میں ہے۔

فَلَمَّا آتَاهَا نُورًا دَرَىٰ يَا مُوسَىٰ إِنِّي  
 أَنَا رَبُّكَ

(ظہ)

جب موسیٰ درخت کے پاس آئے تو ان کو نورا  
 دی گئی کہ اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں۔

اس سے بھی واضح تر یہ ہے۔

وَنَادَىٰ نَاهُ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ  
 الْأَيْمَنِ (مریم)

اور ہم نے موسیٰ کو طور کی دائیں جانب سے  
 ندادی۔

حضرت آدم کے واقعہ میں ہے۔

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا  
 سَوَاتِحُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ  
 عَلَيْهِمَا مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ وَنَادَىٰ  
 هُمَا رَبَّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَنْ  
 تِلْكَ الشَّجَرَةِ وَأَقُلَّ لَكُمَا  
 إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ

جب آدم اور حوا نے درخت کو چکھا تو ان کا ستر  
 ظاہر ہو گیا اور یہ جنت کے پتوں سے اپنا تن  
 ڈھانکنے لگے اور ان کے رب نے ان کو ندادی  
 کہ کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع  
 نہیں کیا تھا اور نہیں کہا تھا کہ شیطان  
 تم دونوں کا کھلا ہوا دشمن ہے۔

ایک جگہ ہے۔ (اعراف)

وَيَوْمَ نُبَادِيهِمَا مِنْ شَرِّكَائِي  
 الَّذِينَ كَفَرُوا تَزْعُمُونَ

اور جس دن خدا ان کو ندادے گا کہ وہ کہاں ہیں  
 جن کو تم میرا شریک سمجھتے تھے۔

یہ اور ان کے علاوہ اور بھی متعدد آیات ہیں جن میں خدا کے ندادیے کا ذکر بہ صراحت  
 مذکور ہے اور چونکہ ندا کا تحقق بغیر صوتِ مسموع کے نہیں ہوتا۔ اس لئے ان آیات سے ہی یہ بھی معلوم  
 ہوتا ہے کہ خدا کے لئے صوت ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری کی احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے  
 قرآن اور نطق ربانی | لیکن یہ امر قابلِ غور ہے کہ جہاں تک قرآن مجید یا کسی اور آسمانی کتاب کے نزول کا



تعلق ہے اس سلسلہ میں خدا کی نڈیا صوت کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں ہے بلکہ حضرت جبریل کے قلم کے ساتھ تشبیہ دے کر غالباً اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جس طرح قلم کے ذریعہ کاتب کا پیغام مکتوب الیہ تک پہنچ جاتا ہے اور آواز نہیں ہوتی اسی طرح خدا کا پیغام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک بغیر کسی نطق اور صوت کے پہنچتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي  
عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ  
يَعْلَمُ

آپ پڑھئے اور آپ کے رب اکرم نے قلم  
کے ذریعہ تعلیم دی ہے اس نے انسان کو  
وہ چیزیں بتائیں جنہیں وہ نہیں جانتا تھا۔

ان اوزں سے کلام الہی کی صورتیں اس کے علاوہ کلام الہی کے سلسلہ میں قرآن نے بتایا ہے کہ خدا انسانوں سے کتنے مختلف طریقوں سے کلام کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ  
إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ رَاءِ حِجَابٍ أَوْ  
رَسُولٍ رَسُولًا فَيُوحِي بِلَاذْنِهِ  
مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلَىٰ حَكِيمٍ عَدِيمٍ

اور کسی بشر کی یہ مجال نہیں ہے کہ اللہ اس سے  
کلام کرے مگر وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کے آڑ  
سے یا یہ کہ وہ کسی قاصد کو بھیجے جو اللہ کے حکم  
سے جو کچھ وہ چاہے پہنچائے بے شبہ اللہ تعالیٰ بلند اور حکیم ہے

لہ عام مفسرین جبریل کے لئے قلم کا استعارہ کرنے میں یہ حکمت بیان کرتے ہیں کہ اللہ اور آنحضرت کے درمیان جبریل کا واسطہ محض قلم کا ساتھ جس طرح کتابت قلم سے ہوتی ہے لیکن اس کو کاتب نہیں کہا جاتا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ وحی پہنچتی تھی جبریل سے پہنچتی تھی لیکن ان کی حیثیت قلم سے زیادہ نہیں تھی اور وحی صرف ذاتِ خداوندی تھی اس توجیہ کے خوب ہونے میں کلام نہیں لیکن ممکن ہے اس میں یہ حکمت بھی ہو کہ قلم کے ذریعہ سے جو پیغام پہنچتا ہے وہ بہ نسبت پیغام زبانی کے عالمگیر اور ہر زمان و مکان میں یکساں کارگر ہوتا ہے۔

۱۱۹ یہ آیت مشکلات قرآن میں سے ہے اشکال یہ ہے کہ اس آیت میں کلام الہی کو (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۸ پر)

اس آیت میں کلام الہی کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ وحی کے ذریعہ سے کلام، پس

دقیقہ حاشیہ صفحہ گذشتہ، مقسم قرار دے کہ اس کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں اور اقسام نے چونکہ آپس میں تقسیم ہوتے ہیں اس لئے وہ ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے اس بنا پر خدا کا جو کلام بذریعہ ارسال رسل ہوگا اس کو وحی نہیں کہہ سکتے حالانکہ قرآن مجید سب کا سب بواسطہ رسول (قاصد) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے اور وہ وحی ہے دوسرا اشکال یہ ہے کہ اُوْیْرِسِلْ رَسُوْلًا فِیْ حَیْیٰ بِاِذْنِہِمْ اٰیۡتِہٖمْۙ میں فیوحی کو ارسال رسل پر متفرع کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی خود ارسال رسل کی ایک قسم ہے حالانکہ آیت کے پہلے حصہ میں کلام الہی کو تین قسموں پر منقسم کر کے وحی کو ارسال رسل کا قسیم بتایا گیا ہے تو اب تقسیم شے کا تقسیم بنا لازم آگیا۔ وہو محال حضرت الامام مولانا سید محمد الیوز شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے مشکلات القرآن پر اپنی یادداشتوں میں اس آیت کا بھی ذکر کیا ہے اور اس آیت کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ اشکال خود بخود رفع ہو جاتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں "اَلَا حَیْیٰ" اس سے مراد ہے ہر طریق وحی یعنی مصدر بیان نوع کے لئے ہے اور چونکہ خدا نے اس وحی کی اسناد اپنی طرف کی ہے اور مابعد کی دو قسموں کو اس کا مقابل ٹھہرایا ہے اس لئے اس وحی سے مراد القافی القلب ہے اور نفث فی الروح (دل میں پھونکنا یا ڈالنا) خواہ یہ بجالت بیداری ہو یا بجالت خواب۔ اس مخصوص مراد کی وجہ سے وحی کی قسیم اپنے دونوں قسموں سے ممتاز ہو گئی "اُوْمِنْ وِرَاجِ حِجَابٍ" اس سے مراد ہے پس حجاب اس طرح کلام کرنا کہ منکلم نظر نہ آئے اور ایک غیبی آواز سنائی دے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ نے سنا یا شب معراج میں آنحضرت کو پیش آیا "اُوْیْرِسِلْ رَسُوْلًا فِیْ حَیْیٰ" اس میں ایجا اور وحی کرنے کی اسناد خدا کی طرف نہیں بلکہ رسول کی طرف ہے۔ اس لئے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس صورت میں فرشتہ پیغمبر سے بالمشافہ گفتگو کرتا ہے اس نتیجے سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ ایجا اول الذکر وحی سے متغائر ہے یعنی ایک وحی بلا واسطہ ہے اور دوسری بلا واسطہ اور متغائر ہے اشی نفسیہ کا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

پردہ کلام اور کلام بذریعہ قاصدان تینوں قسموں میں سے کسی نہ کسی طریقہ کلام سے ہر پیغمبر  
 کو شرف خطاب عطا فرمایا گیا ہے حضرت موسیٰ کو کلام پس پردہ کے شرف سے نوازا گیا کہ وہادی  
 سینا کے ایک درخت سے انھوں نے صوت ربانی سنی۔ باقی رہیں دو صورتیں تو وہ تمام  
 پیغمبروں کے لئے پائی گئی ہیں اور تیسرا ان میں جگہ جگہ ان کا ذکر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ  
 علیہ وسلم کو تینوں طریقہ یاں خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا جس کی تفصیل آگے اپنے  
 موقع پر آئے گی۔

# ملکہ نبوت اور وحی

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ خدا اپنے خاص خاص بندوں سے مختلف طریقوں سے خطاب و کلام کرتا ہے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء بھی تو آخر ہمارے جیسے انسان ہی ہوتے ہیں پھر ان میں ایسی کون سی خصوصیت ہے کہ خدا ان سے کلام کرتا ہے اور وہ خدا کے کلام کو سمجھتے بھی ہیں لیکن ان کے علاوہ کوئی اور شخص شرف خطاب ایزدی سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ آپ نبوت کی حقیقت کو تفصیلاً نہیں تو اجمالاً ہی سمجھ لیں امام رازی نے مطالبہ عالیہ میں امام غزالی نے معارج القدس میں حافظ ابن تیمیہ نے کتاب النبوات اور دوسری تصنیفات میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے حجۃ البالغہ میں اور مولانا محمد قاسم النانوتوی نے تقریر و لپیڈیر میں اس عنوان کے ماتحت مستقلاً نہایت جامع اور سیر حاصل بحثیں کیں ہیں۔ ان سب کا اگر خلاصہ بھی نقل کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جائے۔ ہم ذیل میں اب ان سب تقریروں کو سامنے رکھ کر نبوت کی حقیقت پر ایک اجمالی بحث کرتے ہیں۔ پہلے بطور مقدمہ چند باتوں کا جان لینا ضروری ہے۔

حکمت (۱) تمام فلاسفہ اس پر متفق ہیں کہ انسان کے انسان کامل ہونے کا دار و مدار اس کے حکمت آداب ہونے پر ہے۔ یہی وہ طغرائے امتیاز ہے جس کے باعث انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے اور یہی وہ شرف عزت ہے جس کو قرآن مجید میں۔

وَمَنْ يُّؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَنَحْنُ لَا نَعْلَمُ الْحِقَابَ ۗ

اور جس کو حکمت دی گئی اسے بہت بڑی خیر دی گئی

فرما کر بیان کیا گیا ہے حکمت کے کہتے ہیں اصولی اعتبار سے اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے سب جانتے اور مانتے ہیں کہ انسان میں اصلی قوتیں دو ہیں ایک قوتِ نظری جس سے انسان انبیاء کے حقوق اور ان کے حسن و قبح کو معلوم کرتا ہے اور دوسری قوتِ عملی جس کے ذریعہ انسان کوئی عمل کرتا ہے ان دونوں قوتوں میں حاکم کون ہے اور محکوم کون یا افضل و مفضول کس کو کہنا چاہئے اس کو رہنے دیجئے کہ ہمارے موضوع بحث سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بہر حال یہ مسلم ہے کہ حکمت جس کو کہتے ہیں وہ انہیں دو قوتوں کے کمال کا نام ہے کمال سے مراد یہ ہے کہ دونوں قوتیں نہایت صحیح اور نادرست ہوں یعنی انبیاء کے حقائق اور ان کے حسن و قبح کے متعلق قوتِ نظری کا فیصلہ بالکل واقعہ کے مطابق ہو اس میں کسی فریب یا کج نظری کو کوئی دخل نہ ہو اسی طرح قوتِ عملی کے کمال کے معنی یہ ہیں کہ کسی فعل و عمل کے اخذ و ترک پر قوتِ عملی کی تحریک اس فعل کے حسن و قبح پر مبنی ہو وہ ہم کو صرف اسی فعل کے کرنے پر برانگیختہ کرے جو حسن ہونے کے باعث حقیقتاً قابل اخذ ہو اسی طرح وہ ان افعال سے بہ شدت روکے جو قبیح ہونگی وجہ سے لائق ترک ہوں۔

مراتب کمال و نقص کا تفاوت | (۲) یہ ظاہر ہے کہ تمام انسانوں میں یہ دونوں قوتیں یکساں نہیں ہوتیں بلکہ ضعف اور قوت زیادتی اور نقص کے اعتبار سے ان میں بے شمار مراتب مختلفہ پائے جاتے ہیں انہیں مراتب کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح شکل و صورت اور رنگ و روپ میں کوئی ایک شخص پورے طور پر کسی دوسرے شخص کے برابر یا مثل نہیں ہوتا اسی طرح فضائل اخلاق اور طہکاتِ نفسی میں بھی دو انسان ایک دوسرے کے مماثل و مساوی نہیں ہوتے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مرتبہ کمال و نقص میں ایک ایک درجہ ایسا ضرور نکلے گا کہ پھر اس کے اوپر (مرتبہ کمال میں) یا اس کے نیچے (مرتبہ نقص میں) کوئی اور درجہ نہیں ہوگا۔

اشکال و تجل | (۳) کسی انسان کی یہ دونوں قوتیں جب مکمل ہوتی ہیں تو ان کے کمال کا ایک

یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ انسان خود ہی کامل نہیں ہوتا بلکہ اس کی قوتیں اپنے کمال میں کچھ ایسی متضابطیسی جاذبیت اور کشش بھی رکھتی ہیں کہ دوسروں کو متاثر کرتی ہیں اور دوسروں کی قوت نظری اور قوت عملی کو بھی کمال کی طرف مائل و راغب کر دیتی ہیں۔

ان مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد سمجھئے کہ جس کو نبی کہتے ہیں وہ ہی ہوتا ہے جس کی دونوں قوتیں 'نظری اور عملی' انتہا درجہ کی کامل ہوتی ہیں اور وہ دوسروں کی ان قوتوں کو بھی کامل کر سکتا ہے۔

مذکورہ حدس ایہاں تک جو گفتگو کھتی وہ نبوت کی عام حقیقت سے متعلق تھی لیکن چونکہ یہاں ہمارا مطلق نظر نبی کی استعدادِ وحی سے بحث کرنا ہے جس کا تعلق قوتِ نظری سے ہے اس لئے ہم یہاں قوتِ عملیہ کو نظر انداز کر کے قوتِ نظری کے متعلق ذرا تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں اس کے بعد یہ امر خود بخود واضح ہو جائے گا کہ صرف پیغمبر ہی کیوں کلامِ الہی و شرفِ اندوز ہو سکتا ہے۔

تقریر بالا سے یہ معلوم تو ہو ہی چکا ہے کہ نبی کی قوتِ نظری تمام انسانوں سے زیادہ کامل اور افضل ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو دوسرے نفظوں میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ فکر و ادراک کے اعتبار سے ایک انسان دوسرے انسان سے مختلف و متفاد ہوتا ہے

کوئی عیبی ہوتا ہے اور کوئی ذہین پھر عبادت اور ذہانت کے مراتب و مدارج بھی بشمار ہیں۔

لیکن جانبِ نقصان و کمال میں دونوں مرتبے ایسے نکلتے ہیں کہ پھر ان کے اوپر یا نیچے کوئی اور مرتبہ نقصان و کمال نہیں پایا جاتا۔ ابن سینا نے اشارت میں لکھا ہے کہ ہم مرتبہ نقصان

میں دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ عبادت و بلاوتِ طبع کے ایسے افضل اسافلین درجہ میں ہوتے ہیں

کہ معمولی سے معمولی بات بھی آپ ان کو لاکھ مرتبہ سمجھائیں ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ جانبِ نقصان کے انتہائی مرتبہ میں ایک ایسے شخص کا موجود ہونا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اس کے بالمقابل مرتبہ

کمال میں بھی ایک ایسا شخص ہوگا جو بغیر کسی تعلیم و تعلم کے اپنے نفس کے ادنیٰ انفعات سے ان  
شکل سے شکل مسائل حیات کو آسانی سلجھا سکے گا جو دوسروں کے لئے عقده لائیل ہوں گے  
فلاسفہ ایسے شخص کو صاحب قوۃ قدسیہ یا صاحب حدس تمام کہتے ہیں۔

علماء شریعت کی اصطلاح میں جس کو نبی کہتے ہیں اس کی قوت فکر و حدس کا اندازہ  
فلاسفہ کے مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ امام غزالی احوال العلوم میں عقل  
کے مراتب متفاوتہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ومن انكر تفاوت الناس في  
هذه العزیزة فكان من ضل عن  
ربقته العقل وكيف ينكر تفاوت  
العزیزة ولولا انهما اختلفا لانا  
في فهم العلوم ولما انقسموا  
الی بلید لا يفهم بالتفہیم  
الابعد تعب طویل من المعلم  
والی ذکی يفهم بادی رمز و  
اشارة والی کامل تبعث من  
نفسه خفايق الامور بدون  
التعلیم كما قال تعالیٰ یکادزیها  
یضی وکولده تمسسه نار نور علی  
نور ذالک مثل الانبیاء اذ یتضم

اور جو لوگ اس عزیزہ عقل میں لوگوں کے  
تفاوت ہونے کا انکار کرتے ہیں انھوں نے  
گو یا عقل کی رسی اپنی گردن سے نکال پھینکی ہو  
اور بھلا اس تفاوت فی العزیزة کا انکار کس طرح  
کیا جاسکتا ہے اگر یہ تفاوت نہ ہوتا تو لوگ  
علوم کے فہم میں مختلف نہ ہوتے اور نہ ان کا انقسام  
ہوتا ایسے بلید و غبی کی طرف جو تنہیم کے بعد بھی  
نہیں سمجھتا مگر اس وقت جب کہ معلم کو طویل تعب  
برداشت کرنا پڑتا ہے اور ایسے ذکی کی طرف  
جو ادنیٰ رمز اور اشارہ سے بات کو سمجھ جاتے ہیں  
اور ایسے کامل کی طرف جس کے اپنے نفس سے  
بغیر تعلم کے خفایق امور پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ  
تعالیٰ منبرماتا ہے قریب ہے کہ زمین کا

لہر فی باطنہما مورعاً مضتہ  
من غیر تعلم و سماع و یعتبر عن  
ذالک بالالہام (ج ۱ ص ۷۸)

تیل آگ چھوئے بغیر ہی روشن ہو جائے یہ نور علی  
نور ہے اور ان کا ملوں کی مثال انبیاء کی سی ہے  
کیونکہ ان کے دلوں میں بغیر تعلم و سماع کے ہی  
باریک باریک امور واضح ہو جاتے ہیں اور اس  
کمال کو الہام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پھر آگے چل کر اس تفاوت فی العقل کو مثال سے اس طرح سمجھاتے ہیں۔

وانقسام الناس الی من تنسب  
من نفسہ و یفہم والی من لا  
یفہم الا بتنبیہ و تعلیم والی  
من لا ینفعہ التعلیم ایضاً ولا  
التنبیہ کا انقسام الارض الی  
ما یجتمع فیہ الماء فیقوی فی تفسیر  
بنفسہ عیوناً والی ما یحتاج الی  
الحفر لینخرج الی القنوات والی  
ما لا ینفع فیہ الحفر و هو الیابس  
و ذالک لاختلاف جواهر الارض  
فی صفاتها فکذاک اختلاف  
النفوس فی غریزة العقل  
(ج ۱ ص ۷۸)

اور لوگوں کا منقسم ہونا ایسے لوگوں کی طرف جو خود  
بخود متنبہ ہو جاتے ہیں اور سمجھ جاتے ہیں اور  
ان لوگوں کی طرف جو تنبیہ اور تعلیم سے ہی سمجھ  
سکتے ہیں اور ایسے لوگوں کی طرف جن کو تعلیم نفع  
بخشتی ہے اور تنبیہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا  
کہ زمین کئی قسم کی ہوتی ہے بعض زمینیں تو وہ  
ہوتی ہیں جن میں پانی جمع ہوتا رہتا ہے اور جب  
زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ خود چشموں کی شکل میں بہہ  
پڑتا ہے اور بعض زمینیں وہ ہوتی ہیں جنہیں  
کھودنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ پانی کو نہروں  
وغیرہ کی طرف منتقل کیا جائے اور بعض زمینیں  
جو خشک ہوتی ہیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں کھودنا  
بھی فائدہ نہیں دیتا اور لوگوں کی عقلوں کا

ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ زمین کے جوار زمینی صفات میں مختلف ہوتے ہیں۔



اس کے علاوہ امام غزالی نے کتاب المنقذ من الضلال اور احیاء العلوم میں یہ بھی لکھا ہے کہ نبوت مادراء عقل ایک مقام ادراک و احساس ہے جو انسان کے جو اس ظاہرہ اور قوائے باطنہ کے تدبیر کی ارتقاء کے بعد حاصل ہوتا ہے لیکن جس طرح تمیز و عقل کے مدرکات کے لئے جو اس بیکار ہیں اسی طرح اس درجہ کے مدرکات کے لئے عقل بے کار ہے اگر کوئی شخص اس درجہ کا منکر ہے تو اس کا یہ انکار ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی بے عقل کا عقلی امور سے انکار کرنا۔ المنقذ من الضلال میں فرماتے ہیں۔

بلکہ نبوت پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ یہ اقرار	بَلْ اِيْمَانٌ بِالنَّبُوْتِ اِنْ يُقَرَّرَ
کیا جائے کہ عقل سے بالاتر ایک مقام ہے جس	بِاَثْبَاتٍ طَوْرٍ وَّرَءِ الْعَقْلِ تَنْفَعُ
میں آنکھ کھل جاتی ہے اور اس کے ذریعہ مخصوص	فِي رَايِ عَيْنٍ يَدْرِكُ بِهَا مَدْرَكَاتٍ
خاص مدرکات کا ادراک کیا جاتا ہے اور عقل ان مدرکات	خَاصَّةً وَالْعَقْلُ مَعْرُوْلٌ عَنْهَا
کے ادراک سے ایسی ہی عاجز ہے جیسے کان رنگوں	كَعَزْلِ السَّمْعِ عَنِ ادْرَاكِ
کے ادراک سے۔	الْوَانِ الْخَمْرِ

اس بنا پر نبوت کا اصل اذعان و یقین امام صاحب کے نزدیک صرف اس شخص کو ہی ہو سکتا ہے جس کو خود نبوت کا مقام حاصل ہو یا جو نفس قدسی رکھنے کے باعث ما بعد الطبیعی حقائق کو معلوم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو چنانچہ اپنی حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اور خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو اس کا ذوق نہیں	وَبِالْجَهْلَةِ مَنْ لَمْ يَرْزُقْ مِنْهَا شَيْئاً
دیا گیا ہے وہ نبوت کی حقیقت کے سلسلہ میں بجز	بِالذَّوْقِ فَلَيْسَ يَدْرِكُ مِنْ حَقِيقَتِهَا
نام کے اور کسی چیز کا ادراک ہی نہیں کر سکتے۔	النَّبُوْتِ اِلَّا اِلْسَاماً

ذوقِ این بادہ ندانی بخیر آنا بخشی

فلاسفہ کی تعبیر کے مطابق ان ارباب نفوس قدسیہ کا دل آئینہ کی طرح مجلی اور مذکی ہوتا ہے جس میں عقل فعال کی طرف سے جو تمام معقولات اور صور معنویہ کا خزانہ ہے۔ حقائق کا انعکاس ہوتا رہتا ہے اور اس فیضان و تاثر کی وجہ سے وہ بڑی سے بڑی نظری چیزوں کا علم حاصل کر لیتے ہیں جو دوسروں کو بڑی مشق و مہارت کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتا اور یہ علم شائبہ تردد و شک سے آلودہ نہ ہونے کے باعث قطعی اور حتمی ہوتا ہے۔

ملکہ نبوت وہی ہے کسی نہیں | آئینہ کی مثال سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ملکہ نبوت ہر شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ خاص مہربتِ خداوندی ہے جو کسی کسی کو عطا فرمائی جاتی ہے قرآن مجید میں ہے۔

اللہ اعلم حیت یجعل رسالتاً اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنا پیغمبر کس کو بنائے

آپ دیکھتے ہیں آفتاب جہاں تاب طلوع ہو کر کائناتِ عالم کے ذرہ ذرہ پر جلوہ پاش ہوتا ہے اور اس کی شعاعیں در و دیوار مٹی پتھر گھاس اور کوڑا کرکٹ ہر چیز پر پڑتی ہیں لیکن جب یہی شعاعیں کسی آتشی شیشہ پر پڑتی ہیں تو وہ اس کو جگمگا دیتی ہیں یہاں تک کہ خود اس میں سے شعاعیں چھن چھن کر دوسری چیزوں پر جو اس کے بالمقابل ہوتی ہیں عکس رہیں گے۔ لگتی ہیں اسی طرح یقین کر دو کہ جو دیدی دوسری کا خورشیدِ حقیقت اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ روشن ہو اور بلا امتیاز و شمار ہر چیز کو اپنی شعاعوں سے مستفیض کر رہا ہے لیکن یہ اپنی اپنی فطری وجہی استعداد کا فرق ہے کہ ہر چیز اس کی اپنی فطری صلاحیت کے مطابق ہی کسب فیض کر سکتی ہے انبیاء کے نفوس قدسیہ اگر اس آفتاب حقیقت کی نورانی شعاعوں کو جذب کر کے خود منور ہوتے ہیں اور دوسروں کو منور کر دیتے ہیں تو اس لئے کہ وہ آتشی شیشہ کی طرح اس کی فطری استعداد رکھتے ہیں اور اگر ہم ان انوار و تجلیات سے براہ راست اکتساب نور نہیں کر سکتے تو اس کی وجہ یہ ہے

کہ ہمارے دل اور قوارِ مدر کہ اس لوہے کی طرح میں جس کو جلانہ پالنے کی وجہ سے آئینہ کا ہمسر ہونے کا حوصلہ نہیں ہو سکتا۔ الغرض

ہر چہ بہت از قامتِ ناساز و بے اندام <sup>ست</sup> ورنہ تشریف تو برابر بالائے کس دشوار نیست  
شہیدی نے بھی اردو میں اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

عام ہیں ان کے تو لطافِ شہیدی <sup>تبت</sup> تجھ سے کیا ضد کھتی اگر تو کسی قابلِ توبانی  
یہی وہ عام فطرتِ انسانی سے ما فوق باطنی استعداد ہوتی ہے جس کی وجہ سے انبیاء کے حواس عام انسا  
حواس سے بہت زیادہ تیز اور ان کا شعور و ادراک دوسرے لوگوں کے شعور و ادراک سے کہیں  
زیادہ بلند اور اعلیٰ ہوتا ہے اب وہ خد کے ہم کلام ہوتا ہے۔ اسطوانہ خانہ کے گریہ کی آواز سن  
سکتا ہے کنکریوں کی تسبیح سے اس کے کان آشنا ہوتے ہیں اور وہ مسافت اور مکان و زمان کی حد و  
وقود سے گذر کر اپنی آنکھ اور کان سے وہ سب کچھ دیکھ اور سن سکتا ہے جو دوسرے لوگ تو بہر تو  
حجاباتِ نظر و سمع کی وجہ سے دیکھ اور سن نہیں سکتے۔ حریمِ اسرارِ نزل کے محرمِ راز حضرت مولانا  
رومی فرماتے ہیں۔

فلسفی منکر شود در فکر وطن      گو بر دوسر را بران دیوار زن!

نطقِ آب و نطقِ باد و نطقِ گل      بہت محوسِ حواسِ اہلِ دل

فلسفی کو منکرِ خانہ است      از حواسِ انبیا بے گمانہ است

ایک اور نظریہ <sup>یہ</sup> شیخ الاشراف اور بعض دوسرے صوفیاء و فلاسفہ اسلام کا ایک نظریہ یہ ہے کہ کائنات

ہستی تین عالموں کے مجموعہ کا نام ہے جن کو مواہبِ ثلاثہ کہا جاتا ہے یعنی جمادات، نباتات اور حیوانات

ان ہی سے ہر عالم کی انتہا ایک ایسی نوع پر ہوتی ہے جس میں اپنے جنسی و نوعی خصائص کے ساتھ

دوسرے عالم کے بعض خصائص بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً جمادات میں مونگا ایک ایسی چیز ہے

جس میں نباتات کی ایک خاصیت نشوونما پائی جاتی ہے۔ اب ہم نباتات کو دیکھتے ہیں تو اس میں بھی ایک ترقی یافتہ نوع کھجور کی نظر آتی ہے جس میں حیوانات کی طرح تذکیر و مائیت کا فرق قائم ہے اور ان کے مذکر و مؤنث کے پیوند سے جس کو عربی میں تائیر کہتے ہیں کھجوریں پیدا ہوتی ہیں ہندوستان میں ارند، خر بوزہ یا پیتیا اور آم کی بعض قسموں کے متعلق بھی یہی بیان کیا جاتا ہے پھر حیوانات کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ حیوان کی انتہا ایک ایسی قسم مثلاً بن مانس پر ہوتی ہے جس میں بعض انسانی خصائص پائے جاتے ہیں پس جس طرح خاص خاص جادات میں نباتات کے اور خاص خاص نباتات میں حیوانات کے خصائص پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح نوع انسان میں بعض انسان ایسے پائے جاتے ہیں جن میں ملکوتی خصائص ہوتے ہیں پھر ان ملکوتی خصائص رکھنے میں بھی فرق مراتب ہوتا ہے۔ اب ہم کہتے ہیں کہ وہ انسان جس میں تمام ملکوتی اوصاف انسانوں سے بڑھ کر ملکوتی خصائص و صفات پائے جائیں شریعت مذہب کی اصطلاح میں وہی بنی کہلاتا ہے اس اہم خصوصیت کی وجہ سے بنی کے حواس باطنہ و ظاہرہ اس حواس میں ہی محدود نہیں ہوتے بلکہ ان کے علاوہ اس کو بعض ایسے حواس بھی عطا ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اسے عالم مجردات کے ساتھ قریبی اتصال ہوتا ہے اس اتصال کے باعث وہ خدا کا کلام سن سکتا اور سمجھ سکتا ہے اور اس کی آنکھیں ایسے جلووں سے روشن ہوتی ہیں جن کی دید کی تاب چشم ظاہر لاہ نہیں سکتی عارف باللہ مولانا رومی نے بھی مثنوی میں متعدد مواقع پر اس مضمون کو بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں۔

پنج حصے ہست جزایں پنج حص	آں چو زرخ دایں جہاں چہاں
جس ابدان قوتِ ظلمت خورد	جس جاں از آفتابے می چرد
ہر کہ از حس خدا دید آیتے	دربِ حق داشت بہتر طاعتے

گمہ بدیدے جس حیوان شاہ را پس بدیدے گا و حسرا اللہ را

گمہ نبودے جس دیگر مترا جز جس حیوان زبیر و ن ہوا

پس بنی آدم مکرم کے بدے کے جس مشترک محسوم شدے

جو لوگ مادیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور جن کی قوتِ فکر و نظر اس درجہ محدود

ہے کہ وہ جسم اور مادہ کی حد بندیوں سے گذر کر روح اور عالمِ مجردات کی باتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے

ان کو تعجب ہو گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یا کسی اور نبی کو بشر ہونے کے باوصف ایسا کونسا

مقام پیش ہے جس میں آپ جو اس ظاہری سربے تعلق ہو کر عالمِ یقین و مشاہدہ کی حقیقتوں کو علی

وجہ البصیرت دریافت کر سکیں اور پھر انہیں محفوظ بھی کر لیں لیکن یہ لوگ اگر ذرا وسعتِ نظر سے کام

لے کر اپنے احوالِ گمہ و پیش کا جائزہ لیں اور زندگی کے بعض نادرا اور اہم واقعات کا عمقِ نظر

سے مشاہدہ کریں تو انہیں اس دنیا میں ہی بعض مثالیں مل جائیں گی جن سے وحی و الہام اور

عالمِ مجردات سے تعلق کی نسبت ان کا استبعاد دور ہو سکتا ہے اور وہ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ پہلے

جو اس ظاہرہ و باطنہ کے علاوہ بھی خاص خاص لوگوں میں بعض ایسی خاص قوتیں ہوتی ہیں

جن کے ذریعہ وہ بالکل جو اس کی طرح اشیاء کو محسوس و معلوم کر سکتے ہیں۔

کم و بیش تین برس پہلے کی بات ہے پنجاب کا ایک شخص خدا بخش نامی دہلی آیا تھا اور اس

نے اپنے ایک عجیب و غریب باطنی کمال کا مظاہرہ نئی دہلی کے ایک مشہور و متمول سکھ کی کوٹھی

پر کیا تھا اس مظاہرہ میں دہلی کے چند عمائد کے ساتھ اخبار اسٹیشنرین کا نمائندہ بھی موجود تھا تاہم

نے اپنے چشم دید واقعہ کے متعلق جو رپورٹ اخبار میں درج کرائی تھی۔ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

خدا بخش کی دونوں آنکھوں پر کپڑے کی ایک بہت موٹی ٹیٹی باندھ دی گئی جس کے بعد

کسی چیز کو دیکھنے کا امکان ہی نہ تھا اس کے بعد اس سے ایک ایسے کمرہ سے گزرنے کے لئے کہا گیا

جس میں جا بجا منتشر کریاں اور میزیں بغیر کسی ترتیب کے ڈال دی گئی تھیں۔ خدائے بخشہ حالت میں ایک بالکل تندرست بینا انسان کی طرح کرسیوں سے بچتا بچتا مکرہ سے باہر نکل گیا اس کے بعد خدائے بخشہ کے کہنے پر اس کو اردو اور انگریزی کے بعض اخبارات جن میں اخبار اسٹیشن بھی تھا پڑھنے کے لئے دئے گئے اور مختلف جگہوں سے پڑھنے کے لئے کہا گیا شخص موصوف نے انھیں بھی صاف صاف بغیر کسی وقت و دشواری کے اس طرح پڑھ دیا کہ گویا اس کی آنکھوں اور اخبارات کے درمیان کوئی چیز حائل ہی نہیں ہے۔ کمال کا مظاہرہ کرنے کے بعد خدائے بخشہ نے ایک تقریر کی جس میں اس نے بتایا کہ دراصل انسان کے دماغ میں آگے کی جانب بعض ایسے بہت ہی چھوٹے چھوٹے غدود ہیں جن سے اگر مشق و ممارست بہم پہنچائی جائے آنکھوں کا کام لیا جاسکتا ہے یہاں تک کہ اگر آنکھیں بالکل ضائع ہو جائیں اور قوت بینائی باقی نہ رہے تو انسان ان غدودوں کے ذریعہ چیزوں کو دیکھ سکتا اور کتاب وغیرہ پڑھ سکتا ہے۔ تقریر کے آخر میں خدائے بخشہ نے کہا کہ میں نے سالہائے دراز کی مشق کے بعد یہ کمال حاصل کیا ہے لیکن میں اب بھی اس پر قانع نہیں ہوں میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھ کو اس قوت میں ابھی اور اضافہ کرنا ہے۔“

بعض واقعات ایسے بھی نظر سے گذرتے ہیں کہ انتہائی اجرت انجینروں نے ہیں اور ان کا مشاہدہ کرتا ہے، لیکن کوئی عقلی یا منطقی تحلیل و توجیہ نہیں کر سکتا۔ مولانا حفیظ الرحمن صاحب سیو ہاروی رفیق علی ندوۃ المصنفین سانپ کے کاٹے کا ایک کامیاب عمل جانتے ہیں جس کا خود میں نے اپنے اکابر و احباب کے ساتھ متعدد بار عینی مشاہدہ کیا ہے۔ اس عمل کیلئے خود مار گزیدہ کا مولانا موصوف کے سامنے موجود ہونا شرط نہیں ہے وہ خواہ کتنے ہی فاصلہ پر ہو کوئی مضائقہ نہیں۔ مولانا کو جو شخص اس واقعہ کی اطلاع دے گا وہ اسے فوراً تھوڑا پانی کچھ

پڑھ کے اور دم کر کے پلائیں گے خدا کی شان اور پانی کا گھونٹ اس مخبر کے حلق سے نیچے اترے گا اور ادھر مار گزیدہ سے زہر کا اثر کم ہونے لگے گا یہاں تک کہ تھوڑی دیر کے بعد بالکل جا تا رہے گا۔ اب ان واقعات پر غور کرو اور بتاؤ کہ وہ لوگ جنہوں نے اپنی آنکھ سوان کا مشاہدہ کیا ہے کیا وہ ایک لمحہ کے لئے بھی ان کو درست ماننے میں تامل کریں گے ہرگز نہیں تو پھر وہ کوئی ان واقعات و حقائق کی منطقی و عقلی توجیہ و تاویل بھی کر سکتے ہیں؟ بالکل نہیں بلکہ دیکھنے والوں کو اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ بعض بعض انسانوں میں غیر معمولی ذہانت و ذکاوت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان سے ایسے عجیب و غریب اور محیر العقول کارنامے سرزد ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر ہم فطرت و استعجاب سے زنگشت بند ہوں تو ہو سکتے ہیں مگر اس کو سمجھ نہیں سکتے اسی طرح مار گزیدہ کے عمل کو دیکھ کر اس بات کا تو یقین ہو جاتا ہے کہ دواؤں اور جڑی بوٹیوں کی طرح بعض الفاظ و کلمات میں بھی ایسا اثر ہوتا ہے کہ وہ زہر کا اثر تار دیتے ہیں لیکن یہ کیونکر اور کس طرح اور انہیں الفاظ کی یہ خصوصیت کیوں ہے؟ دوسرے نفلوں میں یہ اثر کیوں نہیں پایا جاتا؟ اور اچھا نفلوں میں تریاتی اثر ہوتا ہے تو آخر یہ کیا معاملہ ہے کہ ان الفاظ کا دم کیا ہوا پانی پیتا ہے ایک بالکل غیر متعلق شخص جس نے آکر خبر دی ہے اور اچھا ہو جاتا ہے مار گزیدہ یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جن کا کوئی حل نظر نہیں آتا اور انسان کے لئے بجز اس کے کوئی اور چارہ کار نہیں رہتا کہ وہ اپنی عقل و ذہن کی نارسائی کا اقرار کرے اور جو کچھ دیکھ رہا ہے یا جس کو معتبر اور سچے راویوں کے ساتھ اس کے ہونے کا یقین کر لے کتنی ہی عجیب و غریب خبریں ہیں جن کو آپ روزانہ اخباروں اور رسالوں میں پڑھتے ہیں اور ان کو محض اس بنا پر سچ مان لیتے ہیں کہ کسی معتد اخبار کے نامہ نگار نے ان کو بیان کیا ہے یا چند امریکہ اور یورپ کے ڈاکٹروں نے ان کا ذاتی طور پر تجربہ کیا ہے۔

نظر کو ذرا وسیع کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ صفات و خصائص کا یہ فرق و امتیاز انسانوں

تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اتحاد جنسی نوعی کے باوجود ایک نوع کے مختلف افراد میں ہی بعض  
انفرادی خصوصیات کے باعث اتنا عظیم الشان فرق پایا جاتا ہے کہ ان پر مختلف انواع سے  
تعلق رکھنے کا شبہ ہوتا ہے مٹی اور پتھر اور لعل و یاقوت سب جمادات ہیں مگر ایک تاج سلطانی  
اور قبائے شاہی کی زینت بنتا ہے اور دوسرا کم از کم ہونے کی وجہ سے انسانوں اور چوپایوں کے  
قدموں سے ٹھکرایا جاتا ہے پھر لعل اور یاقوت بھی سب ایک طرح کے نہیں ہوتے بعض لعل ایسے  
ہوتے ہیں کہ پیش بہا بلکہ بے بہا ہونے کے باعث بڑی سے بڑی سلطنت کے خزانہ کے لئے  
سرمایہ فخر و ناز ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ایسے لعل گنتی میں دو تین سے زیادہ نہیں ہوتے اور ان  
کے بالمقابل دوسرے لعل ایسے ہوتے ہیں جن کو صورت و شکل اور رنگ میں یکساں ہونے کے  
باوجود ہر تمول اور صاحب ثروت انسان کی جیب خرید سکتی ہے۔ خوب اچھی طرح غور کرو، لعل و عقیق  
اور زمرد و گوہر کیا ہیں؟ پتھر ہی تو ہیں مگر پھر یہ کیا ہے کہ ایک پتھر پتھر ہی رہا دوسرے پتھر کو آفتاب کی  
شعاعوں نے اپنے مسلسل عمل تربیت سے لعل درخشاں اور یاقوت تاباں بنا دیا حالانکہ آفتاب کی  
شعاعیں دونوں پر یکساں ہی پڑتی ہیں جس کو تم آئینہ کہتے ہو کیا اس کی حقیقت لوہے سے کچھ  
مختلف ہے؟ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ صنایع کے دست بہارت نے لوہے کے ایک ٹکڑے کو مساف  
و شفاف روشن آئینہ بنا دیا جو سورج کی شعاعوں کو اپنے سینہ میں جذب کر کے اپنے مقابل کی چیز پر  
عکس فلگن ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس دوسرا لوہا وہی لوہا رہا جو دست آہنگ سے آگ کی بھٹی میں  
جلتا ہے اور پھر سوہان پر تھوڑے کی ضرب کھاتا ہے۔ پھول پھول سب برابر ہیں لیکن عجیب بات  
ہے کہ ایک پھول اپنی جاں نواز خوشبو سے قلب و دماغ میں عطر کی لہریں دوڑا دیتا ہے اور اس بنا  
پر کسی کے کاکل غمزہ آگئیں کی زینت یا کسی کی دستار عزت و افتخار کی رونق بنتا ہے اور دوسرے پھول  
اس سے کم یا بالکل خوشبو نہ رکھنے کے باعث جس ٹہنی پر اپنی آنکھ کھلتے ہیں بالآخر اسی پر باد



خزائن کے جھونکے کی تاب نہ لا کر فنا ہو جاتے ہیں یہ سب چیزیں تو خیر پھر بھی جو اہر یعنی قائم بالذات  
 ہیں الفاظ تو اعراف ہی ہیں آپ نے سانپ کے عمل کا حال پڑھ کر اندازہ کر لیا ہو گا کہ خود ان  
 میں بھی حیثیت ملفوظیت میں برابر ہونے کے باوجود کتنا عظیم الشان فرق و امتیاز ہوتا ہے۔  
 پس جب آپ عالم ہست و بود کی متحد النوع اشیا میں صفات و خصائص انفرادی کے  
 باعث اتنا اختلاف پاتے ہیں تو پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ انسانوں میں ایک انسان اپنے  
 غیر معمولی قوی باطنیہ یا کسی ایک خاص قوت کی زیادتی کی وجہ سے عام انسانوں کے برخلاف خدا  
 سے شرف ہم کلامی حاصل کرے جس طرح سالہائے دراز کے بعد آفتاب کا فیض اثر ایک معمولی  
 سے پتھر کو لعل و عقیق کی شکل میں تبدیل کر کے اسے کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے اسی طرح یقین کر و  
 خورشید حقیقت کے انوار و تجلیات جب اپنے مخصوص فیضان و اثر کے لئے کسی خوش نصیب  
 انسان کو چن لیتے ہیں تو پھر وہ دنیا میں نبی بن کر ظاہر ہوتا ہے اور اس سے ایسے معجزے صادر ہوتے  
 ہیں جن کو دوسرے لوگ نہیں کر سکتے اور جس طرح لعل و عقیق روز بروز نہیں پیدا ہوتے اسی طرح  
 انبیاء کرام بھی کبھی کبھی مبعوث ہوتے رہے ہیں۔

سالہا باید کہ تا یک سنگ صلی ز آفتاب لعل باشد در بدخشاں یا عقیق اندرین

اور اب چونکہ ہمارے اعتقاد میں معدن ہستی کا وہ نور ہیرا جو یوم الست سے ذات احدیت  
 کے آفتاب عالم تاب کی اس خوش مشیت میں تربیت پاتا تھا اور جس کی آمد و موعود کے انتظار میں کائنات  
 عالم کا ذرہ ذرہ شب و روز کی ایک ایک ساعت بڑی بے چینی اور اضطراب سے گن رہا تھا اس  
 جہان آب و گل میں جلوہ فرور ہو کر دنیا کے اخلاق و انسانیت کے گوشہ گوشہ اور چہ چہ کو منور کر  
 چکا اس لئے اب آئندہ اس نوع کا کوئی گوہر گراں مایہ (نبی) دنیا میں نہیں آئے گا۔ البتہ ہاں اس  
 سے کم درجہ کے جو اہر ہر زمانہ میں موجود رہیں گے اور اس سیرے کی قائم مقامی کا فرض انجام دیتے رہیں گے۔

نبی کی بشریت | یہاں تک نبی کی اس قوت کا ذکر تھا جس کے ذریعہ وہ خدا کا کلام سن سکتا اور  
سمجھ سکتا ہے اب ہم نبی کی پیغمبرانہ حیثیت پر ایک دوسرے پہلو سے بحث کرتے ہیں۔

چونکہ نبی اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان خدمتِ سفارت و رسالت انجام  
دینے کے لئے آتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس میں ملکہ نبوت اور استعدادِ وحی کے ساتھ  
بشریت بھی پائی جائے تاکہ وہ ملکہ نبوت کے ذریعہ خدا کا کلام سنے اور بشر ہونے کی وجہ سے  
عام انسانوں تک اس پیغام و کلام کو پہنچا سکے اور اپنے عمل و قول سے اس کی تشریح و تفسیر بھی  
کر سکے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرآن میں ارشاد ہے۔

وَلَوْ جِئْنَاكَ مَلَكَاجَلْنَاكَ رَجُلًا ۗ  
اور اگر ہم فرشتہ کو پیغمبر بنا دیتے تو اسے بھی آدمی

راغمام کی ہی شکل میں بھیجتے۔

قاضی بیضاوی نے اس مسئلہ کی توضیح ایک نہایت عمدہ مثال سے کی ہے۔ آیت  
وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۗ كِي تَفْسِيرِ كِي ذِي لِي لِكْتِي لِي

الانتری ان الانبیاء لما فاقت ۗ کیا تم نہیں دیکھتے کہ چونکہ انبیاء کی قوت فائق

قوتہم واشتعلت قریحتہم اور ان کی طبیعت اس درجہ روشن ہوتی ہے کہ

مجیث یکادزیتہا یضی و لو لم مجیث یکادزیتہا یضی و لو لم

مستسند نارارسل الیہم ۗ ہے اس لئے خدا ان کے پاس فرشتے بھیجتا ہے

ملائکتہ ومن منہم علی اور جو زیادہ اونچے مرتبے والے ہوتے ہیں ان

رتبہ کلمہ بلا واسطہ تکما سے بیواسطہ کلام کرتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ

کلم موسیٰ علیہ السلام فی المیقات سے میقات میں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے

و محمد صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج میں کیا، طبیعات میں اس کی نظیر

لیلتا المعراج ونظیر ذالک فی  
 الطبیعتان العظمیٰ لما عجز عن  
 قبول الغذاء من اللحم لما بینها  
 من التباعد جعل البارئ  
 تعالیٰ حکمتاً بینہما الغضروف  
 المناسب لہما لیاخذ من هذا  
 ویعطى ذالک

یہ ہے کہ چونکہ تباعد کی وجہ سے ہڈی گوشت  
 سے غذا قبول نہیں کر سکتی اس لئے اللہ نے  
 اپنی حکمت سے ان دونوں (گوشت اور ہڈی)  
 کے درمیان چبھنی ہڈی پیدا کر دی  
 جو دونوں سے مناسبت رکھتی ہے تاکہ وہ غذا  
 اس سے لے اور اس کو دے

غرض یہ ہے کہ انبیاء کرام میں جسمائیت اور روحانیت کا ایسا پاکیزہ امتزاج  
 ہوتا ہے کہ ایک طرف وہ بشر ہوتے ہیں اور دوسری جانب ان کی رسالی خظیرۃ القدس  
 کے اس مقام جلیل و عظیم تک ہوتی ہے جہاں جانے کا حوصلہ جبریل امین کو بھی نہیں ہوتا  
 اگر یک سر موئے برتر پریم! فروغ تجلی بسوزد پریم!  
 اس بنا پر صرف انبیاء ہی اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان سفارت  
 رسالت کی خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ عام انسانوں کی طرح فرشتے بھی اس خدمت  
 کو ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

## وحی اور محققین یورپ

اہل مغرب تمام مذہبی قوموں کی طرح سولہویں صدی تک وحی کے قائل رہے کیونکہ ان کی کتابیں انبیاء کے حالات و واقعات سے پڑھتیں جب سائنس کا دور شروع ہوا اور روحانیت سے ہٹ کر لوگوں کی توجہ مادیات کی طرف زیادہ ہو گئی تو پھر فلسفہ منتر نے اعلان کیا کہ وحی کا مسئلہ بھی ان پرانے خرافات میں سے ہے جو جہالت و نادانی اور وہم پرستی کے باعث انسانوں کے قلب و دماغ پر اب تک مسلط رہے ہیں اس فلسفہ نے مابعد الطبیعی حقائق کے انکار میں اس درجہ غلو کیا کہ سرے سے خدا اور روح کا ہی انکار کر دیا اس سلسلہ میں وحی کی نسبت کہا گیا کہ یہ یا تو نبوت کا دعویٰ کرنے والوں کی اختراع ہے جو انھوں نے لوگوں کی توجہ تائب کو اپنی طرف مائل و راغب کرنے کے لئے اختیار کر لی ہے اور یا کسی قسم کا نہیان ہے جو بعض اعصاب کے مریضوں کو لاحق ہو جاتا ہے اس بنا پر ان کو بعض چیزوں کی صورتیں تماش نظر آتی ہیں حالانکہ حقیقت میں ان کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی۔

فلسفہ یورپ نے وحی اور دوسری مابعد الطبیعی چیزوں کی نسبت اپنے اس نظریہ کا اس زور و شور سے پروپیگنڈا کیا کہ یہ نظریہ فلسفہ کا ایک مستقل عقیدہ بن گیا اور ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو عالم یا معلم یافتہ کہلانا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اس نظریہ کا قائل ہونا ضروری ہو گیا۔

لیکن ۱۸۴۶ء میں امریکہ میں وجود روح کے آثار و علامات نظر آئے جنھوں نے امریکہ سے گذر کر تمام یورپ کے خیالات میں توجہ پیدا کر دیا اور لوگوں کو ایسے عالم روحانی کے وجود کا اثر

کرنا پڑا جس میں بڑی بڑی عقلیں اور روشن افکار آباد ہیں تو اب مسائل روحانیہ میں بحث و فکر کا نقطہ نظر بھی بدل گیا اور وحی کا مسئلہ از سر نو زندہ ہو گیا علماء نے اس مسئلہ پر پھر بحث شروع کر دی لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان کی یہ بحث کسی مذہبی جذبہ پر نہیں بلکہ علم تجربی کے قواعد پر قائم تھی اس بنا پر ہمیں تعجب نہ کرنا چاہئے اگر وہ وحی کے باب میں ان نتائج و افکار تک نہیں پہنچ سکے جو علماء اسلام کے نزدیک مسلم ہیں تاہم علماء مغرب کی تحقیق و تفتیش اور اس کے نتائج و استنباطات سے یہ ضرور معلوم ہوا ہے کہ جو لوگ وحی کو نذیان محض یا وہم و گمان سمجھتے تھے آخر کار ان کو بھی اسکی واقعیت و صداقت کا اقرار کرنا پڑا۔ ہم صرف یہی فرق دکھانے کے لئے ذیل میں علماء مغرب کے افکار و نظریات مختصراً قلمبند کرتے ہیں ممکن ہے اس سے منکرین وحی کو کچھ تنبیہ ہو اور وہ اپنے اصرار پر نظر ثانی کرنے کی زحمت گوارا کریں۔

مجالس تحقیق | یورپ میں روح اور اس کے اثرات کی تحقیق کی طرف بعض علماء کو توجہ ہوئی اور انہوں نے اپنے نتائج فکر شائع کئے تو تمام فضا میں ایک آگ سی لگ گئی بمقام لندن میں ایک کمیٹی بنی جس کا مقصد نفض اور اس کے متعلقات پر بحث کرنا اور ان کی تحقیق و جستجو کرنا تھا اس کمیٹی میں جو علماء و اساتذہ شریک تھے ان میں قابل ذکر اور نمایاں تر یہ حضرات تھے۔

- |                                 |  |
|---------------------------------|--|
| (۱) پروفیسر جیک کیمرن یونیورسٹی | صدر کمیٹی انگلستان کا مشہور عالم طبیعیات |
| (۲) پروفیسر سیرا لینفر لوڈگ     | علم طبیعیات کا ماہر خصوصی                |
| (۳) سر ولیم کروکس               | انگلستان کا مشہور عالم کیمسٹری           |
| (۴) پروفیسر فریڈرک مائرس        | کیمرن یونیورسٹی                          |
| (۵) پروفیسر ہڈسن                | "  |

(۶) پروفیسر ولیم جیمس ہر فورڈ یونیورسٹی امریکہ

(۷) پروفیسر بلینز لوب

کولمبیا یونیورسٹی

(۸) کامیل فلامرویون

فرانس کا ماہر مشہور فلکیات و ریاضیات

ان کے علاوہ یورپ کے مشہور علماء و کارنے باریٹ اور بوڈمور بھی اس کمیٹی میں شریک تھے کمیٹی تقریباً تیس سال تک قائم رہی اس مدت میں اس نے ہزاروں روحانی واقعات و حوادث کی تحقیق کی اور نفس انسانی اس کے قوی اور قوت ادراک سے متعلق بار بار تجربے کے جو چالیس ضخیم جلدوں میں مدون و محفوظ ہیں اس کمیٹی نے اپنے نتائج فکر کی اشاعت کی تو انہوں نے ثابت کیا کہ انسان کے لئے ایک اور شخصیت بھی ہے یعنی ہم اپنی موجودہ زندگی میں زندہ ہیں اور ادراک کرتے ہیں لیکن ہمارا یہ ادراک ان تمام روحانی قوتوں کی وجہ سے نہیں ہوتا جو ہمارے اندر موجود ہیں بلکہ ان روحانی قوتوں کے کسی ایک جز سے ہوتا ہے جس کا اثر جو اس جسم کے افعال کے ذریعہ ظاہر ہوتا رہتا ہے لیکن جو زندگی کہ ہم کو یہ جو اس بنخشے ہیں اس سے بھی کہیں زیادہ بڑھ کر ایک اور زندگی ہے جس کی عظمت و جلالت کی کوئی نشانی اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتی جب تک کہ ہماری یہ ظاہری شخصیت نیند یا کسی اور ذریعہ سے معطل نہ ہو جائے چنانچہ ہم نے ان لوگوں پر جن کو مقناطیسی نیند کے ذریعہ سلا دیا گیا تھا تجربہ کر کے دیکھا کہ سونے والے کو روحانی زندگی کی دولت فراوان حاصل ہوتی ہے اور وہ اس عالم میں اپنے جو اس ظاہری کے علاوہ کسی اور حاسہ کے ذریعہ دیکھتا اور سنتا ہے۔ بعید چیزوں کی خبریں دیتا ہے اور اس وقت اس کی قوت تعقل و ادراک پورے طور پر بیدار ہو کر اپنا کام کرتی رہتی ہے۔

کمیٹی کے نزدیک یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ انسان کی ظاہری شخصیت کے علاوہ ایک اور شخصیت ہے جو پہلی شخصیت سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور ارفع ہے۔ ان علماء نے یہ بھی معلوم کیا کہ یہی وہ اعلیٰ شخصیت ہے جس کے ذریعہ جسم میں جسم کا تگون ہوتا ہے اور جگر قلب اور معدہ وغیرہ

مخاض جن پر انسان کے ارادہ کو کوئی دسترس حاصل نہیں ہر ان کی حرکت بھی اسی علی شخصیت سے ہوتی ہے بلکہ حق یہ ہے کہ انسان کا انسان ہونا اسی شخصیت ظاہرہ پر نہیں جس کا قیام اس جسم ظاہرہ کے ساتھ ہر اور یہی وہ شخصیت ہے جو جسم کے کثیف پردوں کے درمیان سے عمدہ عمدہ خیالات پیدا کرتی ہے الہامات طیبہ کا تعلق بھی اسی سے ہے اور یہی وہ قوت ہے انبیاء کے قلب میں ان چیزوں کا القاء کرتی ہے جن کو اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی کہتے ہیں پھر بھی یہی وحی مجسم ہو کر نظر آتی ہے تو اس کو اللہ کے فرشتے کہتے ہیں جو آسمان سے نازل ہوتے ہیں

ہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ علماء مغرب وحی کی جو حقیقت بیان کرتے ہیں وہ بعینہ وہ نہیں ہے علماء اسلام نے بیان کی ہے لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ روح اور وحی والہام کے تصور کو کھلی ہوئی لگا رہی اور ان کے تقاد کو وہم پرستی کہنے والے یورپ کے علماء محققین بھی عرصہ دراز کے غور و خوض کے بعد کس طرح ان چیزوں کی حقیقت کے قائل ہو گئے اور اگرچہ انہوں نے ان چیزوں کی اصلی حقیقت کے بیان کرنے میں اسلامی نقطہ نظر سے چند در چند غلطیاں کی ہیں لیکن پھر بھی حیرت کی بات ہے کہ ان علماء نے اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے وہ بعض اہل اسلام کے بیانات سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے اور جو تقریر نقل کی گئی ہے ایک طرف تم اسے پڑھو اور دوسری جانب امام غزالی کی تقریر ذیل پر غور کرو جو انہوں نے وجود کی تین قسمیں وجود حسی۔ وجود عقلی اور وجود خیالی بیان کرنے کے بعد آخری قسم وجود خیالی کی تشریح میں کی اور پھر دیکھو کہ امام صاحب کی یہ تقریر اور محققین پوز نے تالیف فکر کس قدر ایک دوسرے سے ملنے جلتے ہیں امام صاحب منسرماتے ہیں۔

”وجود خیالی یہ ہے کہ زبان حال تمثیلی رنگ میں محسوس اور مشاہد بن کر سامنے آئے اور یہ خاص انبیاء

پس منمیروں کی شان ہے اس کی مثال خواب کی ہے جس طرح خواب میں زبان حال منمیروں کے علاوہ عام آدمیوں کی بھی تمثیلی رنگ میں نظر آتی ہے اور وہ آوازیں سنتے ہیں مثلاً کوئی خواب دیکھتا ہے کہ اونٹ اس سے باتیں کر رہا ہے یا گھوڑا اس کو خطاب کر رہا ہے یا کوئی مردہ اس کو کچھ دے رہا ہے (بقیہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۲)

ان علماء محققین کی رائے ہے کہ یہ شخصیت باطنہ حسن کے ذریعہ مدرک ہوتی ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ مقناطیسی نیند سوتے ہیں ان میں پسندیدہ عقل روشن فکر نظر رس نفوس کے پوشیدہ اسرار میں اثر و نفوذ مخفی باتوں کو معلوم کر لینے کی صلاحیت قابلیت اور اپنی حالت ظاہرہ کے اعتبار سے جاہل غبی ہونے کے باعث دنیا کے وسیع امکانات میں سفر یہ تمام چیزیں اس بات کی سبب قوی دلیل ہیں کہ انسان کے لئے ایک ایسی (باطنی) شخصیت پائی جاتی ہے جو جسمانی حیات کے پردوں میں مستور رہتی ہے اور وہ اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب کہ اس کا جسم طبعی یا صناعتی نیند میں مصروف ہو۔

پھر رویا و صحیحہ بھی جو صبح روشن کی طرح وقوع پذیر ہوتا ہے اور جس کے ذریعہ انسان غیبی امور کو دریافت کر لیتا ہے یا جس میں وہ بعض اوقات ایسے ایسے شکل مسائل حل کر لیتا ہے جنہیں وہ بیداری کی حالت میں حل نہیں کر سکتا تھا یا جس میں بعض اوقات وہ ایسے اعمال کر گزرتا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۱) یا اس کا ہاتھ پکڑ رہا ہے یا اس سے چھینتا ہے یا یہ دیکھے کہ اس کا من شیر ہو گیا ہے یا اسی قسم کی صورتیں جن کو لوگ خواب میں دیکھا کرتے ہیں انبیاء عظیم السلام کو یہ چیزیں بیداری میں نظر آتی ہیں اور اسی بیداری کی حالت میں یہ چیزیں ان سے خطاب کرتی ہیں ایک جاگتا ہوا آدمی جس کو یہ چیزیں نظر آتی ہیں اور محسوس ہوتی ہیں وہ اس بات میں کچھ فرق نہیں کر سکتا کہ یہ خیالی گویائی ہے یا خارجی اور حسی ہے خواب دیکھنے والے کو تو یہ فرق اس لئے محسوس ہو جاتا ہے کہ وہ جاگ اٹھتا ہے اور خواب و بیداری دونوں کی حالتوں میں وہ فرق محسوس کرتا ہے جن لوگوں کو ولایت نامہ حاصل ہوتی ہے ان کو یہ تمثیلی رنگ تنہا نظر نہیں آتا بلکہ اس کا اثر عام حاضرین پر بھی پڑتا ہے اس کی ولایت اپنے فیض کی شعاعیں ان پر ڈالتی ہے اور وہ بھی وہی دیکھے ہیں جو صاحب ولایت کو نظر آتا ہے اور وہی سنتے ہیں جو صاحب ولایت کو سنانی دیتا ہے۔



جن کی بحالت بیداری وہ کبھی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا اس بات کی دلیل یہ ہے کہ انسان کے لئے اس کی ظاہری شخصیت کے علاوہ ایک اور باطنی شخصیت ہے جو پہلی سو کہیں زیادہ بلند اور ترقی یافتہ ہے۔ ان استدلال کے علاوہ اور بھی متعدد امور ہیں جن کا اس تحقیقاتی انجمن نے نہایت دقیقہ رسی سے عمیق مطالعہ کیا پھر ساتھ ہی ان تجربوں کا جائزہ لیا جو ان سے پہلے کئے جا چکے تھے۔ اور آخر کار انہوں نے عالم روح اور اس کے لطائف و مزیایا کھلے دل سے اقرار کر لیا۔ اس سلسلہ میں کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور ماہر علم النفس پروفیسر ڈاکٹر مائرس (Myers) نے جو اس انجمن کے بھی رکن خصوصی تھے انسانی شخصیت (Human Personality) پر ایک نہایت قابل قدر کتاب لکھی ہے جس کے متعدد ابواب میں مقناطیسی نیند، عقربیت وحی اور شخصیت باطنی پر سیر حاصل بحث کی ہے ہم ذیل میں چند اقتباسات کتاب مذکور کے صفحہ ۷۷، اور اس کے بعد کے صفحات سے نقل کرتے ہیں۔

پروفیسر مائرس نے سب سے پہلے ان ریاضی دانوں کا ذکر کیا ہے جو شکل سے مشکل مسائل ریاضی کا درست حل فوراً بغیر کسی غور و فکر کے معلوم کر سکتے ہیں پھر لطف یہ ہے کہ اگر ان سے پوچھا جائے کہ تمہیں یہ جواب کیوں کر معلوم ہوا تو وہ بجز اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ میں معلوم نہیں اس سلسلہ میں پروفیسر موصوف نے بید لرنامی ایک شخص کا ذکر کیا ہے جو بڑے سے بڑے عدد کے متعلق یہ بتا سکتا تھا کہ وہ کن اعداد کی ضرب سے حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ اس سے پوچھا گیا کہ وہ کیا کیا اعداد ہیں جن کو ضرب دیا جائے تو اس نے غور و مامل کے بغیر فوراً کہا کہ ۳۳ کو ۵۳ میں ضرب دیا جائے تو نتیجہ میں یہ عدد پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس سے پوچھا گیا کہ کس قاعدہ اور حساب سے اس نے کہا میں اس سے واقف نہیں گویا اس کا یہ جواب ایک طرح کا طبعی اقتضا تھا جس میں انسان کے ارادہ اور فہم کو دخل نہیں ہوتا۔

مستر سکریشتر نے مطران دہلی سے نقل کیا ہے کہ اس نے ایک مرتبہ خود اپنی نسبت بیان کیا کہ جب میں پانچ چھ برس کی عمر کا تھا تو میں جمع و تفریق کے سوالات کسی کاغذ پر لکھے بغیر زبانی ہی بہت جلد حل کر دیا کرتا تھا۔ میری یہ حالت تین سال تک رہی مگر تعجب کی بات ہے کہ جب میں بڑا ہوا اور اسکول میں داخل ہو کر باقاعدہ ریاضی کا پڑھنا شروع کر دیا تو میرا یہ خصوصی امتیاز یا ریاضیات کے ساتھ طبعی مناسبت و فراست تدریجی طور پر کم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اب میں ریاضی کا ایک بہت ہی کمزور طالب علم ہوں اس موقع پر ایک اور واقعہ کا ذکر کرنا مناسب نہ ہو گا جو مولانا عبدالباری ندوی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

”تریگون متی (Trigonometry) یا ساتھ المثلثات وغیرہ ریاضیات عالیہ کی وہ شاخیں ہیں جن کی کالجوں میں ریاضیات کے اعلیٰ مدارج میں تعلیم دی جاتی ہے، ۱۱ برس کے بچے جو علی العموم زیادہ سے زیادہ سکول کی چوتھی پانچویں جماعت میں پڑھتے ہیں ان کی ریاضی دانی بس حساب کے چند ابتدائی قواعد تک محدود ہوتی ہے جو لڑکے غیر معمولی طور پر ذہین و مخنتی ہوتے ہیں اور جن کی تعلیم کا گھر پر معلم رکھ کر کچھ خاص اہتمام کیا جاتا ہے وہ بہت ترقی کرتے ہیں تو ۱۳-۱۴ برس کی عمر میں اسکول کی تعلیم پوری کر لیتے ہیں۔

لیکن گذشتہ سال اکتوبر میں (۱۹۰۶ء کا تار۔ لیڈر اخبار) راج نرائن نامی ۱۱ برس کے ایک مدرسی لڑکے کا معجزہ ریاضیات (اسی عنوان سے) یہ چھپا تھا کہ اس نے بلا کسی معلم کی مدد کے اعلیٰ الجبر، تریگون متی، تحلیلی اقلیدس (جو میٹری) وغیرہ از خود حاصل کی ہو (سیرۃ النبی ج ۳ ص ۱۳۹) پر ڈیفیسر رائس نے الہامی طور پر ریاضی جاننے والوں کا تذکرہ کرنے کے بعد چند شعرا اور دوسرے لوگوں کا ذکر کیا ہے اور بعض خواب کے عجیب و غریب واقعات بیان کئے ہیں اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

”میں یقین کرتا ہوں کہ اس قسم کے واقعات دنیا میں پہلی مرتبہ ہی ظاہر نہیں ہوئے بلکہ اس سے پہلے بھی لوگوں کے علم میں آچکے ہیں یہ سب ہمارے شعور باطنی کے کرشمے ہیں جو ہر دور اور ہر زمانہ میں موجود رہتا ہے“ پھر آخر میں کہتے ہیں۔

”اب میں پورے وثوق اور جزم و اذعان کے ساتھ کہتا ہوں کہ انسان میں ایک روح کا وجود یقینی ہے جو اپنے لئے قوت اور جلال کا اکتساب عالم روحانی سے کرتی ہے اور ساتھ ہی میں اس بات کا بھی یقین رکھتا ہوں کہ تمام عالم میں ایک روح کبیرہ سرایت کے لئے ہوئے ہے جس کے ساتھ انسانی روح کو اتصال حاصل ہو سکتا ہے“

اپنی اس تحقیق کے ساتھ ہی مارٹس نے فرانس کے مشہور رپورٹسریور ڈیسیس ریوس سے یہ بھی نقل کیا کہ ”انسان کی باطنی شخصیت ہی وہ چیز ہے جس کو عام لوگ وحی کہتے ہیں، اس حالت کے لئے طبعی صفات و خصائص ہیں جو اس کے ساتھ ہی منحصر ہیں، یہ باطنی شخصیت ہر چیز سے مقدم ہے اور یہ نہ کسی شخص کے سامنے بھکتی ہے اور نہ انسانی ارادہ کے تابع ہے جس وقت یہ عمل کرتی ہے تو اس طرح کرتی ہے کہ گویا وہ انسان کی کوئی صفتِ غریبہ و فطریہ ہے اس باطنی شخصیت سے مدد و طلب کی جا سکتی ہے لیکن اس پر کوئی جبر نہیں کیا جا سکتا“

علامہ فرید وجدی نے دائرۃ المعارف کی جلد رابع میں لفظ روح کے ماتحت ایک نہایت مبسوط و مفصل اور جامع مقالہ لکھا ہے جس میں انھوں نے اسپرٹزم درو حائزیت کی تاریخ محققین یورپ و امریکہ کی تحقیقاتی انجمنیں، ان انجمنوں کی رپورٹیں، مشہور محققین کے حسبہ حسبہ اقوال بیان کیے ہیں اور اسی سلسلہ میں انھوں نے سینتالیس علماء و محققین کے ناموں کی ایک منتخب فہرست دی ہے جو روح کے وجود اور اس کے لطائف و مزایا کا حتمی طور پر یقین رکھتے تھے۔ ان کا مختصر تذکرہ بھی طوالت

۱۴ اس حصہ کی اکثر معلومات دائرۃ المعارف فرید وجدی کی جلد ۲۰ لفظ وحی سے ماخوذ ہیں۔

باعث ہوگا۔ اس لئے آخر میں ہم صرف رسل و ولید کی شہادت پر اکتفا کرتے ہیں جو اس نے روح اور اس کے عجائبات کے باب میں قلم بند کی ہے، یہ یاد رکھنا چلیے کہ رسل و ولید طبیعیات میں ڈارون کا ہم پلہ اور اس کا شریک خیال کیا جاتا ہے، اس نے عجائباتِ روح پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں وہ ان الفاظ میں بر ملا اعتراف کرتا ہے۔

”میں کھلا ہوا دمہریہ اور مادہ پرست تھا۔ میرے ذہن میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آسکتا تھا کہ میں کسی وقت روحانی زندگی کا اظہار کروں گا یا مادہ اور اس کی قوت کے سوا ایسے وجود کی تصدیق کروں گا جو اس دنیا میں کار فرما ہے مگر میں کیا کروں میں نے پے پے ایسے محسوس مشاہدات کئے جن کو نہیں جھٹلایا جاسکتا تھا۔ انہوں نے مجھ کو مجبور کر دیا کہ میں ان چیزوں کو حقیقی اور واقعی تسلیم کروں اگرچہ ایک مدت تک میں یہ تسلیم نہیں کرتا تھا کہ یہ آثار روح سے سرزد ہوتے ہیں، لیکن ان مشاہدات نے رفتہ رفتہ میری عقل کو متاثر کرنا شروع کر دیا، نہ بطریق استدلال و حجت، بلکہ یہ مشاہدات کے سپہم تو اثر کا اثر تھا جس سے میں بجز روح کے اعتراف کے کسی اور طریقہ سے بچ ہی نہیں سکتا تھا“

یورپ کے اساتذہ علوم جدیدہ نے روح کے متعلق جو تحقیقات کی ہیں ان سے وہ ان نتائج پر پہنچے ہیں جو کیمیل فلامریان کے نزدیک حسب ذیل ہیں۔

(۱) روح جسم سے جداگانہ ایک وجود مستقل رکھتی ہے۔

(۲) روح میں اس قسم کی خاصیتیں ہیں جو اب تک علوم جدیدہ کی رو سے غیر معلوم تھیں

(۳) روح جو اس کی وساطت کے بغیر متاثر ہو سکتی ہے یا دوسری چیز پر اپنا اثر ڈال سکتی ہے

(۴) روح آئندہ واقعات سے واقف ہو سکتی ہے۔

پھر اس روشنی میں وحی کی نسبت ان علماء کا جو خیال ہو وہ یہ ہے کہ وحی دراصل وحی

انسانی پرابلیک خاص قسم کی تجلی کا نام ہے جو اس پر اس کی شخصیت باطنہ کے ذریعہ ضوئنگن ہوتی ہے اور اس کو وہ باتیں سکھاتی ہے جنہیں وہ پہلے سے نہیں جانتا تھا اور اس کو ایسے امور کی طرف ہدایت دیتی ہے جن میں خود اس کی بھلائی اور اس کی امت کی ترقی کا راز نہنہاں ہوتا ہے۔

وحی کے باب میں علماء اسلام اور ان علماء یورپ میں اتنی بات تو مشترک ہے کہ وحی کا تعلق جسم یا کسی جسمانی طاقت سے نہیں بلکہ روح سے ہے اور یہ انسان کے ارادہ کے تابع نہیں۔ البتہ یہ امر مختلف فیہ ہے کہ اسلام میں وحی فرشتہ کے ذریعہ نبی کے قلب پر اترتی ہے اور ان لوگوں کے نزدیک جس کو فرشتہ کہتے ہیں وہ دراصل انسان کی ہی شخصیت باطنہ ہے جو مشکل ہو کر اس کے سامنے آجاتی ہے لیکن یہ بھی کیا کم ہے کہ ان لوگوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ ایک روح اعظم ہے جو تمام کائنات میں ساری ہے اور انسانوں کی خاص خاص ارواح کو اس کے ساتھ ایک ایسا علاقہ ہوتا ہے جس کے باعث اس سے خارق عادات امور صادر ہوتے ہیں اور اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔ پھر یہ علاقہ کی کمی بیشی کا دار و مدار انسانی روح کی ذاتی استعداد پر ہے۔

اب ذرا غور کیجئے کہ ان محققین یورپ کے الفاظ میں خدا کا اور جب ریل امین کا کہیں نام نہیں آیا ہے لیکن اگر ذرا تغیر و تبدل کر دیا جائے تو یہ بے تامل کہا جاسکتا ہے۔

عبارت ناشتی و حسنک واحد

# تسلی وحی اور نزولِ حبریں

پہلی وحی کے بعد جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، وحی کچھ دنوں کیلئے آنی بند ہو گئی۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔ "اس میں مصلحت یہ تھی کہ پہلی وحی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو دہشت ہوئی تھی وہ جاتی رہے آپ رفتہ رفتہ اس کو برداشت کرنے کے عادی ہو جائیں اور آپ کو اس کے دوبارہ دیکھنے کا اشتیاق بھی پیدا ہو جائے۔" <sup>۱۱</sup>

فترتِ وحی یعنی وحی رک جانے کی مدت میں اختلاف ہے۔ حافظ ابن حجر نے تاریخ امام احمد حنبلہ سے بروایت شعبی نقل کیا ہے کہ یہ مدت تین برس تھی بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ڈھائی سال تھی لیکن ابن سعد نے حضرت ابن عباس کی روایت نقل کی ہے کہ "فترت کی مدت چند روز تھی یہی غالباً صحیح ہے۔" <sup>۱۲</sup>

آنحضرت صلعم کا حزن و ملال | وحی کے رک جانے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا رنج و ملال ہوا <sup>۱۳</sup>

۱۱ فتح الباری ج ۱ ص ۲۲ جدید اڈیشن

۱۲ بعض روایتوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انقطاعِ وحی کا سخت رنج و قلق ہوا اور ادھر ادھر گھسارنا بکار نے طعن و طنز شروع کر دیا تو اس پر سورہٴ الضحیٰ کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

وَالضُّحٰی وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی مَا

قسم ہے وقتِ چاشت کی اور قسم ہے رات کی

جیکہ وہ ساکن ہو گئی ہو آپ کے رب نے آ پکو چھوڑا

وَدَعَاكَ رَبُّكَ وَمَا قَتَلٰی

ہزار نہ اس نے دشمنی کی ہو۔ (تبیحاشیہ ہمنوا آئینہ)

صحیح بخاری کتاب التعمیر میں حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

اور وحی کا آنا رک گیا یہاں تک کہ آنحضرت	وَفَتَّرَ الْوَحْيَ فِتْرَةً حَتَّى حَزَنَ
صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا کہ ہم کو اطلاع ہوئی ہے	الْبَيْتِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
اس کا غم ہوا۔ آپ کئی مرتبہ گھر سے روانہ ہوئے	فِي مَا بَلَّغْنَا حَزْنَ عَدَا مَن مَّرَّ رَأَى
کہ اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹیوں سے گرا دیں لیکن	يَتَرَدَّى مِنْ رُؤْسِ شَوَاهِقِ
جب کبھی آپ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتے تھے تاکہ	الْجِبَالِ فَكَلِمَا أَوْفَى بِذَرْوَةِ جَبَلٍ
اپنے آپ کو گرا دیں تو جبریل ظاہر ہوتے تھے	لِيَكُنَّ يَلْقَى مِنْ نَفْسِهِ تَبْدِي لَهَا
اور کہتے تھے اے محمد آپ سچ مچ اللہ کے رسول	جَبْرِيْلُ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ إِنَّكَ
ہیں یہ سن کر آپ کا قلب سکون پذیر ہو جاتا تھا	رَسُولُ اللَّهِ حَقًّا فَيَسْكُنُ لَذَلِكَ
اور آپ لوٹ جاتے تھے پھر جب وحی	جَاشَهُ وَتَقَرَّ نَفْسُهُ فَيَرْجِعُ فَإِذَا
کی رکاوٹ طویل ہو گئی تو آپ پھر ایسا	طَالَتْ عَلَيْهِ فِتْرَةُ الْوَحْيِ عَدَا مَثَلِ

(بقیہ ماشیہ صفحہ گذشتہ) لیکن ہماری رائے میں یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ فترۃ الوحی کے بعد سب سے پہلے سورہ مدثر کی آیتیں نازل ہوئی ہیں اب اگر سورہ واضحی کا نزول سورہ مدثر کی آیتوں کے بعد مانا جائے تو پھر نزول وحی کے جاری ہونے کے بعد ما وَدَّعَكَ فَرَاكَ كُفَّارِ کی تردید کرنا شان نزول کے ساتھ زیادہ چسپاں نہیں ہوتا اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ سورہ مدثر کے نزول تک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا اعلان ہی نہیں کیا تھا اس لئے وحی کے رک جانے پر کفار کے طعن و طنز کے کوئی معنی نہیں۔ اس بنا پر اس سورہ کے شان نزول سے متعلق وہی روایت صحیح ہے جس کو امام بخاری نے تفسیر سورہ واضحی اور باب کیف نزل الوحی میں نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ بیمار تھے چند روز راتوں کو اٹھ کر عبادت الہی میں مصروف نہ ہو سکے تو ایک ہمسایہ عورت نے آپ کی شانِ فلک نشان میں سخت گستاخانہ کلمات کہے۔ ان کلمات کی تردید میں یہ سورہ نازل ہوئی۔

ذالك فاذا اوفى بذروة جبل  
تبدى له جبريل فقال له مثل ذلك

کرتے کہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتے تھے اس وقت بھی  
جبریل ظاہر ہوتے اور آپ سے وہی فرماتے تھے

فترت الوحي کے بعد آپ پر جو وحی نازل ہوئی اس کا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں تو تشریف لے جاتے رہتے ہی تھے ایک دن آپ حرا سے واپس تشریف لارہے تھے کہ ناگاہ ایک صدائے غیب سنائی دی جو آسمان سے آرہی تھی آپ نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ تھا جو حرا میں آیا تھا یہ فرشتہ اس وقت آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرشتہ کو اس طرح دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے اور گھر واپس آ کر فرمایا ”مجھے کل اڑھا دو“ اسی حالت میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

يَا أَيُّهَا الْمَدَّانِيُّ قُمْ فَإِنِّدِ زُورِيكَ  
فَكَتِرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّحْبَ  
فَا حَجْرٍ ۝ ٢٤

اے کلیم پوش اٹھ اور لوگوں کو ڈرا اور اپنے  
رب کی کبریائی بیان کر اور اپنے کپڑے  
پاک رکھ اور ناپاکی کو دور کر

اس کے بعد وحی کا سلسلہ برابر جاری رہا اور اس کا تارا اس وقت تک نہیں ٹوٹا جب تک کہ آپ اس عالم ناپائدار سے روپوش نہیں ہو گئے ”فخمی الوحي ویتابع“  
حضرت ابن عباس سے ایک روایت ہے کہ آخری آیت قرآن جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے نو یا سات دن پہلے نازل ہوئی سورہ بقرہ کی یہ آیت ہے۔

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهَا إِلَى اللَّهِ  
شَرُّ نَفْسٍ كُلِّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ  
لَا يُظْلَمُونَ

اور ڈرو اس دن سے جس میں تم اللہ کی طرف  
لوٹ جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اس کے عمل کے  
مطابق بدلہ دیا جائے گا اور نہ پر ظلم نہ ہوگا

۲۵ صحیح بخاری باب بدالوحي

۱۵ حمار کہ مغز سے تین میل کے فاصلہ پر ہے



حضرت ابن عباس سے ہی ایک دوسری روایت ہے کہ یہ نہیں بلکہ آیت ربا آخری

آیت ہے۔ واللہ اعلم (تفسیر خازن ج ۱ مطبوعہ مصر ص ۲۵۵)

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع شروع میں نزول وحی کے وقت شدت کا احساس ہوتا تھا اور پھر ربنا بشریت آپ کو وحی کے بھول جانے کا بھی اندیشہ تھا۔ اس لئے آپ نزول وحی کے وقت اپنے لبوں کو جلد جلد حرکت دیتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتُحْجِلَ فِيهَا  
إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ

آپ اپنی زبان کو حرکت نہ دیجئے کہ آپ اسکے  
ساتھ عجلت کریں بے شبہ قرآن کا آپ کے  
سینہ میں جمع کرنا اور اس کا پڑھنا ہمارا ذمہ ہے  
(القیامت)

حضرت ابن عباس سے صحیح بخاری میں روایت ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ جب جبریل آتے تھے تو آپ بالکل خاموش ہو کر سنتے تھے، پھر جب جبریل چلے جاتے تو آپ اس وحی کو اسی طرح پڑھتے تھے جس طرح

کہ جبریل پڑھ کر سنا تے تھے حضرت انس سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آخر عمر میں وحی کی کثرت ہو گئی تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ آخر عمر میں مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اطراف ملک سے وفود کی آمد کا سلسلہ جاری تھا احکام اور لوگوں کے استفسارات بڑھ گئے

پہلی وحی اس وقت آئی جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سن مبارک چالیس سال تھا جیسا

کہ پہلے گزر چکا ہے اس کے بعد کچھ مدت کے لئے وحی کا آنا رک گیا پھر سلسلہ شروع ہوا تو آخر عمر تک

جاری رہا۔ آپ کی وفات ۶۳ سال کی عمر میں ہوئی ہے اس بنا پر وحی کی مدت ۲۳ سال ہے۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے شروع شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرشتہ وحی کے دیکھنے

سے دہشت ہوتی تھی لیکن بعد میں جب آپ ان سے مانوس ہو گئے تو پھر آپ کے شوق و اشتیاق کا یہ عالم ہو گیا کہ اگر کبھی فرشتہ وحی کے آنے میں کچھ دنوں کی تاخیر و تعویق ہو جاتی تو آپ مضطرب ہو جاتے۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل سے فرمایا کہ تم اس سے بھی زیادہ میرے پاس کیوں نہیں آتے؟ اس کے جواب میں حضرت جبریل کی زبانی ارشاد فرمایا گیا۔

وَمَا نَنْزِلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ لَسْنَا  
مَأْمُورِينَ أَعْدِيْنَا وَمَا خَلَفْنَا وَمَا  
بَيْنَ ذَلِكَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ  
نَسِيًّا  
(مريم)

اور ہم تو آپ کے پروردگار کے حکم اور اجازت سے اترتے ہیں اس کو ان تمام چیزوں کا علم ہے جو ہمارے آگے پیچھے اور اس کے درمیان ہیں اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں ہے۔

بارگاہ نبوی میں حضرت جبریل کی آمد کا کوئی وقت متعین نہیں تھا، صبح شام دن اور رات جب خدا کا حکم ہوتا وہ خدمت اقدس میں حاضر ہو کر خدا کا پیغام پہنچاتے تھے۔ تاہم جس طرح بارش ہونے والی ہوتی ہے تو اس کے آثار و علامات پہلے سے فضا میں محسوس ہونے لگتے ہیں۔ وحی کے نزول یا آمد جبریل کا وقت قریب ہوتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سو ہی یہ بات محسوس ہو جاتی تھی اور آپ بے چینی سے اس کا انتظار شروع کر دیتے تھے آپ کی یہ حالت ایسی واضح اور ظاہر ہوتی تھی کہ اگر اس وقت کوئی شخص آپ کے پاس ہوتا تو وہ بھی اس کو محسوس کر لیتا تھا۔

حضرت ابو ذر غفاری کا بیان ہے کہ میں ایک شب میں باہر نکلا تو دیکھا کہ سید ولد آدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا چل رہے ہیں اور آپ کے ساتھ کوئی شخص بھی نہیں ہے میں نے خیال کیا کہ غالباً اس وقت آپ کسی کی معیت پسند نہیں کرتے اس لئے میں چاندنی میں چلنے لگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میں نظر آیا۔ آپ نے پوچھا "کون" میں نے عرض کی "ابو ذر" میں

آپ پر قربان ہوں ارشاد ہوا اے ابوذر ذرا آؤ تو میں اس ارشاد گرامی کے مطابق تھوڑی دور چلا  
تھا کہ زبان نبوت یوں گوہر بار ہوئی "جو ارباب ثروت ہیں وہی قیامت میں کنگال ہوں گے"  
مگر ہاں وہ لوگ متشکی ہیں جن کو اللہ نے مال دیا اور انہوں نے اس کو دائیں بائیں آگے اور پیچھے  
دیا اور اس میں نیکی کے کام کے ابوذر کا بیان ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کچھ دیر تک  
ہی چلا تھا کہ آنحضرت نے فرمایا "تم یہاں بیٹھ جاؤ" یہ فرما کر آپ نے مجھ کو ایسے میدان میں بٹھا دیا۔  
ارد گرد دھچھڑے ہوئے تھے پھر فرمایا "دیکھنا تم یہاں بیٹھے رہنا یہاں تک کہ میں واپس آؤں" اس  
کے بعد آپ حسرہ کی طرف تشریف لے گئے۔ یہاں تک کہ میری نگاہوں سے  
اوجھل ہو گئے۔ آپ دیر تک وہاں ٹھہرے رہے پھر جب آپ آ رہے تھے تو میں نے سنا کہ  
آپ فرما رہے تھے "اگرچہ وہ چوری کرے یا زنا کرے جب آپ آگے تو مجھ سے صبر نہیں ہو سکا اور  
میں پوچھ ہی بیٹھا "اے اللہ کے نبی میں آپ پر قربان ہو جاؤں آپ حرہ کی سمت میں کس سے  
باتیں کر رہے تھے" میں نے تو کسی کی آواز نہیں سنی کہ وہ آپ کی بات کا کوئی جواب دیتا" ارشاد  
ہوا "یہ جبریل تھے جو حرہ کے پہلو میں میرے سامنے آئے اور انہوں نے کہا کہ آپ اپنی امت کو  
خوشخبری سنا دیجئے کہ جس شخص کا انتقال اس حالت میں ہو گیا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں  
بناتا تھا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ میں نے پوچھا "اگرچہ وہ سرقہ یا زنا کرے" جبریل نے جواب  
دیا "ہاں اگرچہ وہ سرقہ یا زنا کا مرتکب ہو" میں نے پھر دوبارہ یہی سوال کیا تو جبریل نے پھر یہی جواب دیا  
حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ آپ نصف شب کو سو رہے تھے کہ اٹھ کر بقیع کے

۱۵ مدینہ منورہ کی شمالی جانب میں ایک مقام کا نام ہے جہاں یزید بن معاویہ کے زمانہ میں مشہور واقعہ قتل و  
قتال ہوا تھا اور جس میں اہل مدینہ پر لڑنے لگنے منظم کئے گئے تھے۔

۱۶ صحیح بخاری کتاب الرقاق

قبرستان میں تشریف لے گئے صبح کو آپ نے فرمایا "رات جبریل نے مجھ کو پیغام دیا کہ میں اس وقت بقیع میں جا کر دعا و مغفرت کروں"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ہر ہر ادا اور آپ کا ہر ہر فعل خدا کے حکم اور اس کے ارشاد کے مطابق ہوتا تھا اس بنا پر اگر کبھی آپ سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا جو منشا خداوندی کے مطابق نہیں ہوتا تھا تو فوراً جبریل امین آکر اس کی اصلاح کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ خندق سے مسلمانوں کی فوج لے کر واپس آئے اور ہتھیار کھول کر غسل فرمایا تو جبریل نے آکر کہا "آپ نے ہتھیار کھول دئے حالانکہ ہم اب تک ہتھیار بند ہیں اور نبو قریظہ کو ابھی ان کی غداری کا بدلہ دینا ہے"۔

حضرت جبریل اگرچہ عموماً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تنہائی میں آتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی اس وقت بھی آتے تھے جب آپ کے پاس مجمع ہوتا تھا یا ایک دو اصحاب بیٹھے ہوتے تھے اس مضمون کی کئی روایات پہلے گزر چکی ہیں ایک مرتبہ آپ ام المومنین حضرت عائشہ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ آپ نے فرمایا "اے عائشہ جبریل تم پر سلام بھیجتے ہیں" ام المومنین بولیں "یا رسول اللہ آپ وہ دیکھتے ہیں جو میں نہیں دیکھتی" ایک دفعہ آپ نے غزوہ بدر میں فرمایا "دیکھو یہ جبریل اپنے گھوڑے کی لگام تھامے کھڑے ہیں"۔

رمضان میں جبریل کی آمد زیادہ ہوتی تھی۔ اس ماہ مبارک میں وہ ہر روز آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید سنتے تھے اور آپ کو سنانے تھے۔

وحی خیر متلو | یہ بات یقینی ہے کہ حضرت جبریل بعض اوقات خدا کی طرف سے ایسے پیغامات بھی لیکر آتے تھے جو قرآن مجید میں موجود نہیں ہیں، اسی بنا پر علماء اسلام نے وحی کی دو قسمیں کر دی ہیں۔

۱۔ نسانی | ۲۔ الاستغفار | ۳۔ بخاری | ۴۔ غزوہ خندق | ۵۔ بخاری | ۶۔ غزوہ بدر

ایک متلو اور دوسری غیر متلو، وحی متلو تو وہی ہے جو قرآن مجید کی صورت میں مسلمانوں کے سینوں میں اور سینوں میں محفوظ ہے۔ دوسری قسم وحی غیر متلو وہ ہے جو احادیث صحیحہ کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے خود قرآن مجید کی تصریح۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اِنْ هُوَ  
اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ رَاجِمًا

اور آنحضرت اپنی خواہش سے نہیں بولتے ہیں  
بلکہ آپ کا نطق وہ وحی ہوتا ہے جو آپ پر بھیجی جاتی ہے

کے مطابق وہ بھی وحی ہے اور ہمارے لئے سُرخ شہد سعاد و فلاح ہے چونکہ احکام و مسائل کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے تھے وحی سے فرماتے تھے اس بنا پر اگر کوئی شخص آپ سے کوئی حکم دریافت کرتا اور وہ آپ کو معلوم نہ ہوتا تو آپ جواب میں خاموش رہتے اور وحی کا انتظار فرماتے تھے یعلیٰ بن ابیہ کا بیان ہے کہ حجۃ الوداع کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجازہ میں قیام پذیر تھے کہ ایک شخص نے آپ کو سوال کیا یا رسول اللہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں جس نے کپڑے میں خوشبو لینے کے بعد احرام کی نیت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قدر انتظار کیا، یہاں تک کہ آپ پر نزول وحی کی کیفیت طاری ہوئی، جب وہ کیفیت زائل ہو گئی تو آپ نے اس سائل کو بلوایا وہ آگیا تو آپ نے فرمایا "جو خوشبو تم مل چکے ہو اس کو تین دفعہ دھو ڈالو اور اس کپڑے کو اتار دو پھر عمرہ ادا کرو۔"

ایک مرتبہ ایک یہودی عالم نے آپ سے پوچھا "بہترین جگہ کون سی ہوتی ہے؟" آپ خاموش رہے اور پھر فرمایا "میں جبریل کے آنے تک خاموش رہوں گا" چنانچہ جب جبریل آئے تو آپ نے ان سے پوچھا "بہترین جگہ کون سی ہوتی ہے؟" جبریل نے کہا "اس مسئلہ میں تو سائل اور مسؤل منہ یعنی آپ اور میں دونوں برابر ہیں لیکن ہاں میں اپنے رب سے سوال کروں گا پھر جبریل (دوبارہ آ)

۱۵۵ یہ روایت اس کتاب میں پہلے بھی ایک جگہ گزر چکی ہے۔

اور انہوں نے کہا "اے محمد! میں اللہ سے اتنا قریب ہو گیا تھا کہ ایسا قریب کبھی نہیں ہوا تھا۔  
آنحضرت نے پوچھا "یہ کیوں کہ ہوا" وہ بولے "میرے اور خدا کے درمیان نوز کے ایک ہزار  
پر دے حائل تھے، اللہ نے فرمایا "بدترین جگہ بازار ہیں اور بہترین جگہ مسجدیں ہیں۔"

(صحیح ابن حبان ج ۱ ص ۱، مطبوعہ مجتہبی پریس ہلی)

وحی متلو اور غیر متلو دونوں میں حکم کے اعتبار سے فرق یہ ہے کہ وحی متلو یعنی قرآن مجید کا  
ایک ایک حرف متواتر منقول ہے اور اس کو وہ بالکل قطعی اور حتمی طور پر خدا کا کلام ہے لیکن اس  
کے برعکس وحی غیر متلو یعنی احادیث احکام و مسائل کا یہ حال نہیں ہے ان کا بہت کم حصہ متواتر  
منقول ہے پھر جو متواتر منقول ہیں، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بھی الفاظ کو خدا  
کے الفاظ نہیں بتایا اس لئے وہ معنی تو ارشاد خداوندی ہیں لیکن لفظاً نہیں۔

# قرآن مجید وحی الہی کیوں ہے؟

گذشتہ مباحث کے بعد آخر میں ایک سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ قرآن مجید وحی الہی کیوں ہے؟ اس کے کیا دلائل ہیں؟ اور وہ کون سے خصائص و اوصاف ہیں جن کی بنا پر قرآن کلام بشر نہیں بلکہ کلام الہی ہے؟ اس سوال کا ایک واضح اور کھلا جواب تو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات جو پیغمبری کے تمام خصائص و محامد کی جامع ہے۔ قرآن کے وحی الہی ہونے کی سب سے بڑی اور روشن دلیل ہے۔ گذشتہ ابواب میں ضمنی طور پر اس کی طرف متعدد جگہ اشارات ملیں گے۔ ہم یہاں قرآن کی صرف حیثیت کلام کو پیش نظر رکھ کر گفتگو کرتے ہیں۔

وصفِ اعجاز | قرآن کے بیشمار خصائص کے لئے ایک جامع لفظ اعجاز ہے یعنی قرآن مجید اپنے اعجاز کے سبب کلام الہی ہے جس طرح کسی جاندار چیز کا پیدا کرنا اور پھر مار ڈالنا۔ آسمان سے پانی کا برسا اور پھر بادلوں کا کھل جانا۔ مشرق سے آفتاب کا طلوع ہونا اور پھر غروب ہو جانا، ہوا کا چلنا اور تھمنا۔ یہ سب چیزیں انسان کے دسترس اور قابو سے باہر ہیں اور اس لئے یہ سب ایک زبردست قوت کے وجود کی دلیل ہیں جو اپنی قدرت و حکمت سے اس کا رگاہ ہست و بود کو انتہائی نظم و انتظام کے ساتھ چلا رہی ہے اسی طرح قرآن کا مسخر نہ ہونا یعنی انسانوں کا اس جیسا کلام لانے سے عاجز رہنا اس کے وحی الہی ہونے کی بٹن دلیل ہے۔

وجہ اعجاز | لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن کا یہ اعجاز کس وصف کے لحاظ سے ہے؟ علماء اسلام نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس سوال کے متعدد جوابات دئے ہیں جن کو مختصراً اس طرح

بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) قرآن مجید کا نظم کلام اور اسلوب ادا محجز ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عرب کے کلام شکر کے لئے جتنے اسالیب مقرر تھے، قرآن مجید نے ان سب سے الگ ایک نیا اسلوب اختیار کیا ہے جس کا مثل لانا انسان کے حیض و قدرت سے باہر ہے یہ مسلک معتزلہ کی ایک بڑی جماعت کا ہے۔

(۲) اشاعرہ قرآن مجید کا اعجاز فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے مانتے ہیں یعنی وہ کہتے ہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا فصیح و بلیغ متکلم بھی قرآن جیسا فصیح و بلیغ کلام نہیں بول سکتا۔  
(۳) بعض متکلمین کے نزدیک قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ایک نبی امی کی زبان سے ادا ہوا  
(۴) بعضوں کی رائے یہ ہے کہ قرآن مجید میں گذشتہ اقوام و مل کے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں اور بعض آئندہ واقعات کے بارہ میں جو پیش گوئیاں کی گئی ہیں اور وہ سب حرف بحرف پوری ہوئی ہیں قرآن ان کے لحاظ سے معجز ہے۔

(۵) بعض علماء کہتے ہیں کہ قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ وہ شروع سے آخر تک ایک ہی اسلوب اور ایک ہی اسٹائل میں ہے۔ اس میں رفع و خفض اور نشیب و فراز بالکل نہیں پایا جاتا۔

(۶) ایک جماعت کہتی ہے کہ اعجاز قرآن کا اصل راز اس کے احکام و تعلیمات میں ہے کہ کوئی انسانی دماغ اس طرح کے معتدل اور پراز حکمت و ہدایت احکام وضع نہیں کر سکتا۔  
(۷) کچھ حضرات کی رائے یہ ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز اس کی حیرت انگیز تاثیر ہے جس سے عربی کا ذوق نہ رکھنے والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

(۸) کسی کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز یہ ہے کہ وہ دلوں کے چھپے ہوئے مجید ظاہر کر دیتا تھا جن تک کسی انسان کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی۔



لیکن اس یہ ہے کہ یہ تمام توجیہات اپنی اپنی جگہ پر قرآن مجید کے حسن تمام وکمال کے کسی ایک رخ کو نمایاں کرتی ہیں ان میں باہمی کوئی تعارض و تضاد نہیں۔ فرض کر دوں کہ حسن و جمال کوئی پیکر تم اگر چند مختلف الذوق لوگوں کے سامنے آجائے تو اس میں سے ہر شخص کس طرح اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کی تشریح و توضیح کرے گا۔ کوئی تناسب اعضاء و جوارح پر فریفتہ ہوگا اور کسی کو رنگ و زینت پر شیفتگی ہوگی، کوئی قد و قامت کی موزونیت پر دل و جان فدا کرے گا اور کسی کو لب لعلین و کامل مشکین کا سودا ہوگا کسی کے لئے چشم زنگسی جادوئے بابل کا کام کرے گی اور کوئی جمال آتشیں کی فوں کاریوں کا ہلاک ستم ہوگا۔ غرض یہ ہے کہ حسن جب کامل اور جمال جب اتم ہوتا ہے تو اس کی ہر ہر اہل نظرہ کو دعوت نظر و دید دیتی ہے اور پھر حسن نظرہ سوز کی جلوہ پاشیوں میں نگاشتیاق کی لنگ پائی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اسے قدم قدم پر جا اس جاست کا سما نظر آتا ہے اور وہ وہیں محو حیرت ہو کر رہ جاتی ہے۔

زفرق تا بقتدم ہر کجا کہ می نگرم! کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا  
لیکن جو اہل نظر ہوتے ہیں وہ جان لیتے ہیں کہ اگرچہ تعبیریں مختلف ہیں اور اندازہ ہائے بیان بھی بدلے ہوئے ہیں لیکن یہ سب رہنمائی کرتی ہیں ایک ہی کی طرف اور یہ سب بیانات ایک حقیقت کلی کی ہی جزئی تشریحات ہیں۔

عباراً: انا شتی و حسنک واحد و کلّ الی ذاک الجمال یشیر  
قرآن مجید نے خود اپنے اعجاز کا دعویٰ کیا ہے اور منکرین کو چیلنج دیا ہے کہ اگر وہ اسے کلام الہی نہیں مانتے تو انہیں چاہیے کہ اس کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سورۃ کا مثل لا کر دکھائیں

(۱) حاشیہ صفحہ گذشتہ، حضرت شاہ ولی اللہ نے الفوز الکبیر باب سوم میں علامہ ابن حزم نے لفضل فی اللیل والنخل میں اور علامہ سیوطی نے اتقان میں اور امام رازی نے تفسیر کبیر میں ان وجوہ اعجاز پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔

اس بنا پر ہم کو ان اختلافات سے قطع نظر کر کے خود قرآن میں تلاش کرنا چاہیے کہ وہ اپنے وجود و اعجاز میں کیا دلائل پیش کرتا ہے۔ گذشتہ باب "وحی اور قرآن" میں بھی ان دلائل کا اجمالی ذکر آچکا ہے۔ ہم یہاں ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے اس سلسلہ میں پانچ چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت (۲) گذشتہ اقوام کے واقعات اور آئینہ واقعات کے متعلق پیشینگوئیاں (۳) فصاحت و بلاغت (۴) قرآنی احکام و مسائل (۵) قرآن کی غیر معمولی تاثیر۔ ذیل میں ان پانچ امور کی تفصیل درج ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت | قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَسْلُو مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ  
وَلَا تَخْطُبُ بِمِثْلِكَ إِذَا كَلَّمْتَ  
تَابِ الْمُبْطِلُونَ ۚ بَلْ هُوَ آيَاتٌ  
بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا  
الْعِلْمَ وَمَا يُحْجَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ  
پھر اسی سورۃ میں آگے چل کر ہے۔

أَوَلَمْ يَكْفِيهِمْ مَا نَزَّلْنَا عَلَيْكَ  
الْكِتَابَ يَتْلُو عَلَيْهِمْ حُرَّةً إِنَّ فِي ذَلِكَ  
لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝

رحمت اور نصیحت ہے۔ (عسکوت)

دیکھو ان آیات میں اللہ تعالیٰ کس طرح قرآن مجید کے وحی الہی ہونے اور اسکے منجانب لائے

نازل ہونے کی نشانی (آیت) یہ بتاتا ہے کہ وہ ایک ایسے نبی امی پر نازل ہوا ہے جو نہ کوئی کتاب پڑھ سکتا تھا اور نہ کچھ لکھنا جانتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی ایسی حقیقت ثابت ہے کہ آپ کی دعوت توحید و اسلام پر برہم ہو کر کفار مکہ نے کیا کچھ نہیں کہا وہ کونسا اقر اور بہتان تھا جو ان لوگوں نے پیغمبر حق کے برخلاف نہیں باندھا۔ آپ کو (معاذ اللہ) ساحر کہا گیا کہ ہن کہا سب کچھ کہتے رہے اور ایذا رسانی میں بھی انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن یہ کہنے کی جرات کسی کو نہ ہو سکی کہ آپ امی کہاں ہیں؟ آپ تو نزولِ قرآن سے پہلے بھی لکھنا پڑھنا جانتے تھے عکاظہ اور ذوالجہند کے سالانہ اجتماعات میں ادھر ادھر کے آتش بیان خطیب اور نامور شعراء جمع ہو کر جو سخن کی نمائش کرتے اور اس آن بان سے فصاحت و بلاغت اور زور بیان و کلام کی داد دیتے تھے کہ تمام مجمع میں دھوم مچ جاتی تھی۔ لیکن آنحضرت صلعم کی بعثت سے پہلے جو عمر مبارک کے چالیسویں سال ہوئی کسی ایک شخص نے بھی نہیں دیکھا اور نہ سنا کہ آپ نے بھی کسی مجمع میں شریک ہو کر کوئی پر زور خطبہ دیا ہو۔ حالانکہ اگر قرآنی فصاحت و بلاغت کا ملکہ آپ کا ایک ذاتی وصف تھا تو اس کا ظہور روز روز نہیں چالیس سال کی عمر سے پہلے کبھی ایک مرتبہ تو ہوا ہوتا یہ ظاہر ہے کہ ہر انسان کے ذاتی جوہر و کمال کے ابھرنے اور نمایاں ہونے کا زمانہ اس کا عہد شباب ہوتا ہے چالیس برس کی عمر سے تو قوی میں انحطاط کے ساتھ انسان کے ذاتی ملکات و صفات میں بھی انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔

ہاں اس میں شبہ نہیں کہ سید کوئین عرب میں سب سے زیادہ فصیح تھے چنانچہ آپ نے خود فرمایا ہے میں تم سب میں فصیح تر ہوں کیونکہ میں قریش کے خاندان سے ہوں اور میری زبان بوسعد کی زبان ہے (طبقات ابن سعد) لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس غیر معمولی فصاحت و بلاغت کے باوصف آپ نے نبوت ملنے سے پہلے کبھی کہیں ایک مرتبہ بھی کوئی ایسا خطبہ دیا جو قرآن مجید

کے انداز بیان اور اسلوب کلام سے ملتا جلتا ہو جس میں قرآن کے بیان کے مطابق حکمت و عظمت اور اسرارِ عالم اور کائنات کے گنجینے بھرے ہوئے ہوں؛ پھر اگر ایسا ہوتا تو آپ کی وہ حیرت و گمشدگی کی حالت کس طرح ہو سکتی تھی جو نزولِ وحی کے بالکل آغاز میں نبیؐ اور سبکی طرف قرآن مجید نے

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ  
اور خدا نے آپ کو حیرت زدہ پایا اور اس کی ہدایت کی

کہہ کر اشارہ کیا ہے۔

پس سوچو اور غور کرو کہ کیا یہ قرآن کا اعجاز نہیں ہے کہ عرب کا ایک گوشہ نشین امی جو نہ لکھنا جانتا ہے اور نہ پڑھنا اور جو نہ علماء کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے اور نہ ایک دو معمولی سفروں کے علاوہ کہیں مکہ سے باہر آتا جانتا ہے جو فصاحت و بلاغت اور شعر و خطابت کی عام گرم بازاری کے اور خود اس فضا میں رہنے کے باوجود نہ ایک شعر موزوں کر سکتا ہے اور نہ کوئی خطبہ دیتا ہے۔ لوگ اسے "صادق" "امین" اور "راستباز" کی حیثیت سے جاننے پہچانتے ہیں لیکن حکمت و فصیح و بلیغ کی حیثیت سے اسے کوئی شہرت حاصل نہیں ہے وہ عمر کا بہترین حصہ (چالیس سال سے پہلے تک) اسی گننامی میں بسر کر دیتا ہے۔ پھر جب قویٰ میں انخطاط کا ذائقہ شروع ہوتا ہے تو یہ ہی امی ایک بالکل عجیب و غریب طرہ پر دنیا کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ جو لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے عالم کون و فساد کے حقائق سے نقاب الٹ دی۔ حکمت و ہدایت کے دفتر کھول دئے، بڑے بڑے فلاسفہ جن اسرار و موزوں کا گناہ کی گرہ کشائی نہیں کر سکتے تھے اس نے چشم زدن میں ان سب کو حل کر کے رکھ دیا پھر اسی خاموش امی کی زبان حق تر جان سے جو پیغام "قرآن" کے نام سے نکلا اس نے فصاحت و بلاغت کے ایسے ایسے گوہر ہائے گراناہیہ کا انبار لگا دیا کہ بڑے بڑے فصحاء و بلغاء کی زبانیں بار بار کے چیلنج کے باوجود اس کے کسی ایک حصہ کا جواب لانے سے بھی گنگ ہو گئیں اور اس

امی کی زبان کا ایک ایک لفظ شدید ترین ظلمتوں میں بھی حقانیت و صداقت کا آفتاب جہاننما بن کر چمکا اور اس طرح چمکا کہ

عالم تمام مطلع انوار ہو گیا

شیخ سعدی کی لغت کے یہ دو شعر پڑھو اور دیکھو کہ اس کا ایک ایک لفظ کس طرح اصل حقیقت کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی کرتا ہے۔

کلمے کہ چرخِ فلک طورِ اوست ہمہ نوز ہا پر تو نوز اوست  
یتیمے کہ ناکر وہ قرآن درست کتب خانہ چند ملت لبشت

تو پھر بتاؤ کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت قرآن کے اعجاز کی دلیل نہیں ہے اور کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن آنحضرت کا نہیں بلکہ خدا کا کلام ہے؟

واقعات غیب | قرآن مجید کے بیان کے مطابق قرآن کے وحی ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اس میں کچھلی قوموں کے ان صحیح صحیح واقعات کا بیان ہے جن کے علم کا کوئی ذریعہ آپ کے پاس موجود نہیں تھا۔ اس طرح کے واقعات کا علم آپ کو تین طریقوں سے ہی ہو سکتا تھا ایک یہ کہ یہ سب واقعات آپ کے سامنے پیش آتے دوسرے یہ کہ آپ نے ان کو کسی کتاب میں پڑھا ہوتا تیسرے یہ کہ آپ کی صحبت ایسے لوگوں کے ساتھ رہی ہوتی جنہیں ان واقعات کا علم تھا اور آپ ان سے ان کا ذکر سنئے۔ قرآن مجید ان تینوں ذرائع میں سے ہر ایک کی نفی کرتا ہے پہلے ذریعہ علم کی نسبت حضرت موسیٰ کے قصہ میں ارشاد ہے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا

آپ مغربی جانب میں نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کو

إِلَىٰ مُوسَىٰ الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ

اپنا حکم بتایا اور نہ آپ وہاں دیکھ رہے تھے

الشَّاهِدِينَ وَلَكِنَّا أَنْشَأْنَا قُرُونًا

لیکن ہم نے کسی جماعتیں پیدا کیں اور ان پر

فَتَطَاوَلْ عَلَيْهِمُ الْعَمْرُ وَمَا كُنْتَ  
 تَأْوِيًا فِي أَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُو عَلَيْهِمُ  
 آيَاتِنَا وَلَكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ وَمَا كُنْتَ  
 بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا وَلَكِنْ رَحْمَةً  
 مِنَّنَّا بِكَ لِنُبَيِّنَ لِقَوْمٍ مَّا آتَاهُمُ  
 مِن نَّبَاتِنَا مِن قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ  
 يَتَذَكَّرُونَ (قصص)

مدت دراز گزر چکی اور نہ آپ مدین والوں میں تھے  
 کہ ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے ہوتے  
 لیکن ہم رسول بھیجتے رہتے ہیں اور نہ آپ طور  
 کے کنارے تھے جب ہم نے ان کو ندادی لیکن یہ  
 آپ کے رب کا انعام ہے تاکہ آپ ان لوگوں کو ڈرا لیں  
 جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا  
 نہیں آیا ہے تاکہ یہ موعظت گیر ہوں۔

حضرت مریم اور حضرت زکریا کے واقعہ میں ہے۔

ذَٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِمْ  
 إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَقُولُ  
 أَقْلَامُهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ  
 وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُخَيِّمُونَ  
 (آل عمران)

یہ گزشتہ زمانہ کی خبروں میں ہے جس کو ہم بذریعہ  
 وحی آپ پر نازل کرتے ہیں اور آپ ان کے  
 پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنا پانسہ ڈال رہے  
 تھے اور نہ آپ اس وقت موجود تھے جبکہ وہ جھگڑ رہے تھے

حضرت یوسف کے واقعہ میں بھی اسی طرح ارشاد ہے۔

دوسرے ذریعہ علم یہ تھا کہ آپ ان واقعات کو کسی کتاب میں پڑھتے قرآن اس کی بھی نفی کرتا ہے  
 چنانچہ اس سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے بیان میں جو آیت گزر چکی ہے اس میں  
 اس مضمون کی صاف تصریح ہے اس کے علاوہ ایک اور آیت بھی ہے۔

مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا  
 الْإِيمَانُ (شوری)

آپ کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا ہے اور  
 ایمان کے کہتے ہیں۔

تیسرا ذریعہ علم یہ ہو سکتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان واقعات کو کسی سے سنتے

قرآن مجید اس کی بھی نفی کرتا ہے۔ ارشاد ہے۔

تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا  
إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا  
قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا (ہود)

یہ غیب کی باتیں ہیں جو آپ پر ہم بطور وحی نازل  
کرتے ہیں اس سے پہلے ان باتوں کو نہ آپ  
جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم جانتی تھی۔

ہر شخص جانتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے چالیس سال کی زندگی

مکہ منظمہ میں گزاری۔ اس تمام مدت میں آپ کا صرف دو مرتبہ شام کے سفر میں جانا ثابت ہوا ایک

مرتبہ آپ اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ گئے تھے۔ اس وقت آپ کا عہد طفولیت تھا اور دوسری مرتبہ

آپ عہد شباب میں تشریف لے گئے تھے لیکن یہ سفر چند روز کے لئے تھا۔ قیام مکہ کے زمانہ میں

آپ قریش والوں میں ہی رہتے سہتے تھے اور یہ لوگ جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے اہل کتاب

نہ ہونے کے باعث گذشتہ اقوام و ملل کی تاریخ سے بالکل نا آشنا تھے۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ تیسرا ذریعہ علم بھی سرسبز منقود تھا۔

ان تینوں ذرائع علم کی نفی کے بعد قرآن کا یہ فرمان کہ تُوْحِيهِا إِلَيْكَ خُودِخُودِوا صَاح

ہو جاتا ہے اور ایک ایسی حقیقت مسلمہ بن کر سامنے آتا ہے کہ کسی کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ یہی

وجہ ہے کہ کفار و مشرکین جس طرح آپ کی امت کی تکذیب نہیں کر سکے۔ ان میں سے کسی ایک

شخص کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ آپ یہ کیسے فرماتے ہیں کہ یہ واقعات غیب مجھ کو وحی

سے معلوم ہوئے ہیں آپ تو یہ واقعات فلاں شخص سے سنتے تھے یا اس کے پاس اپنی نشست

برخواست تھی اس قسم کے دعویٰ کا اظہار اگر ہوتا تو علماء یہود و نصاریٰ کی طرف سے ہو سکتا تھا اور حضور کی ٹہنی

زندگی میں انھوں نے بار بار اسکا امتحان بھی لیا لیکن آخر کار انکو بھی قرآن کے وحی الہی ہونے کا اقرار

کہنا پڑا اور کسی ایک شخص کو بھی آنحضرت کی امت کا انکار کرنے کا جرمہ نہیں ہو سکا۔

واقعات آئندہ کی پیشینگوئی | اخبار عن العیب کے سلسلہ میں قرآن مجید کی وہ پیشین گوئیاں بھی داخل

ہیں جو بعض نہایت ہی مستبعد امور سے متعلق ہیں اور جو حرف بحرف صحیح ثابت ہو کر رہیں۔

غلبہ روم کی پیشین گوئی | ان پیشین گوئیوں میں سب سے زیادہ حیرت انگیز اور نمایاں تر پیشین گوئی غلبہ

روم کی ہے قرآن میں اس کا ذکر اس طرح ہے۔

الَّذِينَ ظَلَمُوا فِي الدِّينِ وَالْمَالِ وَالنَّفْسِ بِمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ  
وَهُمْ مِنَ الْعِبَادِ أَلْفٍ مِّنْ أَلْفٍ

میں اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد چند  
سال میں غالب آجائیں گے اللہ ہی کے

ہاتھ ہے سب کام پہلے اور کچھلے اور اس دن  
بِنَصْرِ اللَّهِ يَنْصُرُ مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ

مسلمان خوش ہوں گے اللہ کی مدد سے اللہ  
جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے اور وہی زبردست

اور رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کا وعدہ ہو چکا اللہ  
لَا يَعْصِي لِرِجَالٍ شَيْئًا

اپنے وعدہ کی خلاف ذکر گیا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے تھے  
جنگ روم و ایران کا واقعہ | اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ عرب کے داعیوں نے بائیس روم اور ایران کی دو طاقتوں

کے مابین قائم تھیں۔ رومی حکومت عیسائی تھی اور ایرانی سلطنت مجوسی۔ دونوں میں ایک عرصہ  
سے کش مکش چلی آرہی تھی۔ ایرانی سلطنت کے تخت پر نوشیروان کا پوتا اور ہرمز کا بیٹا خسرو

(Chosroes) قابض تھا اور رومی حکومت کی عمان اختیار و اقتدار ہرقل (HERACLIUS)  
کے ہاتھ میں تھی۔ ان دونوں حکومتوں میں جنگ و پیکار کا سلسلہ ۶۰۲ء سے ۶۱۶ء تک جاری رہا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت عیسوی تاریخ کے حساب سے ۵۷۰ء میں ہوئی۔

۵۷۰ء میں ہوئی۔



اور ۶۱۷ء میں آپ کے فرق مبارک پر نبوت و رسالت کا تاج زرفشاں رکھا گیا۔ دو لوں سرحدوں کے قرب کی وجہ سے کہ والوں کو طبعی طور پر اس جنگ سے گہری دلچسپی تھی۔ یہاں برابر اس کی خبریں پہنچتی رہتی تھیں۔ ایرانی مجوس یعنی آتش پرست تھے۔ اس لئے کہ کے کفار و مشرکین کو ان کے ساتھ دلی ہمدردی تھی اور وہ دعائیں کرتے تھے کہ جنگ میں ایرانیوں کو فتح و کامیابی حاصل ہو لیکن مسلمان طبعی طور پر رومیوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ عیسائی ہونے کی وجہ سے ایرانیوں کی نسبت ان سے زیادہ قریب تھے۔

ایرانیوں کی فتح | لیکن ایرانی فوج نہایت طاقتور اور منظم تھی اور اہر رومی فوج کا ایک بہترین جنرل نارسیس قسطنطنیہ کے بازار میں زندہ جلوا دیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں نے ایک طرف دجلہ و فرات کے کناروں سے شام کی طرف بڑھا شروع کیا اور دوسری جانب (ایشیا کوچک میں) وہ آذربائیجان آرمینیہ ہو کر اناطولیہ میں داخل ہو گئے۔ رومی افواج کو دونوں طرف سخت ہزیمت اور پانی سے دوچار ہونا پڑا۔

یورپ کے مشہور مورخ گبن کا بیان ہے کہ اس جنگ میں رومیوں کے نوے ہزار آدمی قتل ہوئے۔ کلیساؤں کو آگ لگا دی گئی۔ تین سو برس کی مذہبی مندریں ایک دن میں وقف عام ہو گئیں۔ انتہا یہ ہے کہ بیت المقدس سے عیسائیوں کی سب سے زیادہ مقدس صلیب بھی ایران کو منتقل ہو گئی اور قیصر روم ایک جسد بیجان ہو کر رہ گیا۔ مشرقی ممالک کے نقصان کے علاوہ یورپ میں بھی ان کی حالت بہتر نہ تھی۔ تمام یورپ میں غدر مچا ہوا تھا۔ اسٹریا (ISTRIA) کی سرحد سے تھریس کی دیواروں تک آوارس (Avaras) مظالم ڈھا رہے تھے۔ جنگ اطالیہ میں جن معصوم انسانوں کا خون پانی کی طرح بہا تھا وہ بھی ابھی خشک نہیں ہوا تھا کہ آوارس نے پنونیا (Pannonia) کے مقدس میدان میں مرد قیدیوں کو قتل کر دیا عورتیں اور بچے

غلام بنائے گئے رومی سلطنت قسطنطنیہ کی دیواروں، یونان اٹلی اور افریقہ کے کچھ بقیہ حصوں اور ایشیائی ساحل کے چند بحری مقامات میں صور سے طراز دن تک محدود ہو کر رہ گئی۔ غرض یہ ہے کہ ایک طرف عراق، شام، فلسطین، مصر اور ایشیا، کوچک کے وسیع علاقوں میں ایرانی حکومت قائم ہو چکی تھی ہر جگہ آتشکدے تعمیر ہو رہے تھے اور مسیح کے بجائے آگ اور سورج کی جبری پرستش کو لائی جا رہی تھی اور دوسری طرف خود رومن امپائر کی وسیع مملکت میں بغاوتیں برپا تھیں اور ان بغاوتوں میں افریقہ اور یورپ کے علاقے بھی شامل تھے ظاہر ہے ان حالات میں سلطنت روم کے بے نام و نشان ہو جانے میں کیا کسر رہ گئی تھی۔

مشرکین کو کی مسرت | ان ایرانی فتوحات پر مشرکین کہ جتنے بھی خوش ہوتے کم تھا۔ وہ اس کو مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے لئے فتح کی ایک نیک فال سمجھتے تھے اور مسلمانوں سے بر ملا کہتے تھے کہ جس طرح ایرانیوں نے رومیوں کو ہزیمت فاش دی ہے اسی طرح اگر کبھی تم میں اور ہم میں لڑائی ہوئی تو ہم کو بھی تم پر فتح حاصل ہوگی۔ مسلمان اس صورت حالات پر نہایت دل گرفتہ اور رنجیدہ تھے مگر کر کیا سکتے تھے۔ رضی بحکم ایزدی تھے کہ ناامیدی اور مایوسی کی شدید ترین ظلمتوں میں غلبہ روم کی آیات نے (جو پہلے گذر چکی ہیں) نازل ہو کر دلوں میں پھر امید و حوصلہ کی روشنی پیدا کر دی۔ کفار کو کا استبعاد اور اس کی وجہ | کفار کو اس پیشین گوئی کا علم ہوا تو انھوں نے اس کو نہایت متباعد سمجھ کر مسلمانوں کا مذاق اڑایا اور کہا کہ اچھا آؤ ہم تم شرط کریں کہ اگر رومی واقعی غالب آئے تو ہم

لے گینے اپنی کتاب تاریخ زوال روم جلد ۳ میں ایران و روم کی اس جنگ کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے اردو میں علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرت ابنی جلد ۳ میں اور ہمارے لائق دوست مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایڈیٹر السدوہ نے السدوہ جلد ۲ نمبر ۲ میں گبن کی تاریخ سے ہی اخذ کر کے اس جنگ کے مفصلہ حالات لکھے ہیں ہم نے اس بحث میں ان دونوں مضامین سے استفادہ کیا ہے۔

مسلمانوں کو کئی اونٹ دیں گے اور اگر اس کے برعکس ظہور ہوا تو تو مسلمان اونٹ ہار جائیں گے  
حضرت ابو بکرؓ نے مسلمانوں کی طرف سے اس پیشین گوئی کے ظہور کی مدت چھ سال مقرر کی تھی  
لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا اور شاد ہوا کہ "بیض" کا لفظ تین سے نو تک پر بولا جاتا  
ہے اس بنا پر دس سال سے کم کی مدت مقرر کرنی چاہیے حضرت ابو بکرؓ نے اس ارشاد نبوی  
کے مطابق نو سال کی شرط کی۔"

حقیقت یہ ہے کہ نظر بر اسباب ظاہری ان حالات میں کسی کو یہ خیال بھی نہیں ہو  
سکتا تھا کہ ابھی چند برسوں میں ہی پانسہ بالکل پلٹ جائے گا اور شکست خوردہ رومی پھر طاقتور ایرانیوں  
پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔ کیونکہ ایک طرف ایرانی فتوحات اور طاقت و قوت کا یہ عالم تھا کہ انھوں  
نے رومیوں کے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک چپہ چپین لیا اور دوسری جانب قیصر روم ہرقل  
کی عیش پسندی اور غفلت مآبی کا یہ حال تھا کہ وہ گبن صاحب کے الفاظ میں پرلے درحسب کا  
ست کاہل اور اپنی قوم اور ملک کی بربادی کا نام دہما شانی تھا۔  
"تاریخ زوال روم" کا مصنف لکھتا ہے :-

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایرانی فتوحات کے عین شباب میں پیشین گوئی کی کہ چند  
سال کے اندر اندر رومی جھنڈے دوبارہ فتح کے ساتھ ملند ہوں گے جب یہ پیشین گوئی کی  
گئی تھی اس وقت اس سے زیادہ بعید از قیاس کوئی بات نہیں کہی جاسکتی تھی۔ کیونکہ ہرقل کی  
حکومت کے ابتدائی بارہ سال سلطنت روم کی قریبی تباہی اور خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے۔  
بہر حال یہ وہ نامساعد و ناموافق حالات تھے جن میں قرآن کی طرف سے غلبہ روم کی  
بظاہر بالکل مستبعد پیشین گوئی کا اعلان عام کیا گیا۔ ترمذی میں ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کو اس قدر خوشی ہوئی

لہا مستدرک حاکم جلد ۲ تفسیر سورہ روم و ترمذی باب تفسیر سورہ روم

کہ وہ مکہ کی گلیوں اور بازاروں میں چیخ چیخ کر "المرغلبت الروم فی ادنی الارض وھرم من بعد غلبہم سیغلبون" کی تلاوت کرتے پھرتے تھے۔

پیشینگوئی کی صداقت کا ظہور | یہ آیت بعثت نبوی کے پانچویں سال نازل ہوئی تھی یعنی عیسوی تاریخ کے لحاظ سے ۶۱۲ء میں جب کہ ایرانیوں کے مقابلہ میں رومیوں کی شکست کا آغاز ہو چکا تھا پھر ہوتے ہوتے ۶۱۶ء میں شکست انتہا کو پہنچ گئی۔ آغاز شکست سے پورے آٹھ برس بعد یعنی ۶۲۲ء میں رومیوں کے تین مردہ ہیں پھر جان پیدا ہوئی اور انھوں نے ایرانیوں کے انتہائی جبر و ظلم سے تنگ آ کر ہرقل کی قیادت میں ایرانیوں پر حملہ کر دیا۔ ۶۲۳ء سے انکو قرا مجید کی پیشین گوئی کے مطابق اس حملہ میں کامیابی ہوئی شروع ہوئی اور انجام کار ۶۲۵ء میں رومیوں کی فتح اس شان سے پایہ تکمیل کو پہنچی کہ انھوں نے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک شہر واپس لے لیا اور ایرانیوں کو باسفورس اور نیل کے کناروں سے ہٹا کر پھر دجلہ و فرات کے ساحلوں تک دھکیل دیا۔ کیا عجیب بات ہے کہ ایرانیوں پر رومیوں کی حیرت انگیز فتح و کامرانی کا سال (بلکہ بعض روایتوں کے مطابق مہینہ اور دن بھی) بعینہ وہی سال تھا جس میں مسلمانوں کی تین سو تیرہ کی جماعت قیسیل کو نو سو سے زیادہ مسلح کافروں کی بھاری تعداد کے بالمقابل بدر کے میدان میں عظیم الشان فتح حاصل ہوئی تھی۔

اب غور کرو قرآن مجید نے غلبہ روم کی جو پیشین گوئی کی تھی اس میں چند باتیں خاص طور پر لحاظ کے قابل ہیں۔

(۱) پیشینگوئی حد درجہ ناسازگار حال میں لگنی جبکہ وہیونکی فتح کا بعید احتمال بھی نہیں ہو سکتا تھا  
(۲) پیشینگوئی میں غلبہ روم کی کوئی طویل مدت مقرر نہیں کی گئی۔ بلکہ صرف نو سال بتائے گئے اور یہ ظاہر ہے کہ رومیوں کو جس شان کی شکست ہوئی تھی اس کے

اعتبار سے قیاس نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ نو برس کی قلبی مدت میں اپنی عظمت رفتہ واپس لے لیتے  
 (۳) پھر یہ دیکھو کہ رومیوں کو شکست جس سست اور عشرت پسند کمانڈر کے ہاتھوں  
 ہوئی تھی اب یہ فتح بھی اسی کے زیر قیادت ہوئی ہے۔ گویا یہ وہ پہلا ہرقل ہے ہی نہیں۔  
 (۴) پیشین گوئی کے جو الفاظ میں نہایت واضح اور صاف صاف ہیں ان میں کابینوں  
 اور نجومیوں کی پیشین گوئیوں کی طرح ابہام و خفا یا شک و تردد کی ہلکی سی آمیزش بھی نہیں ہے  
 دیکھو کس محکم جزم و یقین کے ساتھ ارشاد ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ لَا يَخْلِفُ اللَّهُ وَعْدَهُ  
 يَا اللَّهُ كَا وَعْدِهِ - اللہ اپنے وعدہ کا خلاف نہیں  
 وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ  
 کہتا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔

(۵) دنیا جانتی ہے کہ قرآن کی یہ حیرت انگیز پیشین گوئی کس طرح حرف پوری  
 ہوئی اور ٹھیک اسی مدت میں جو قرآن نے مقرر کی تھی۔

اب خود سوچو اور بتاؤ کہ کیا قرآن کی یہ پیشین گوئی اور اس کا سچ ثابت ہونا قرآن کے اعجاز  
 کی اور اس کے وحی الہی ہونے کی بین دلیل نہیں ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اس پیشین گوئی کی صداقت  
 کو دیکھ کر بہت سے کافر مسلمان ہو گئے۔

چند اور پیشینگوئیاں | اس خاص پیشین گوئی کے علاوہ قرآن مجید میں اور بھی پیشین گوئیاں ہیں جو بعد  
 میں حرف بحرف پوری ہو کر رہیں۔ تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے کہ جب مسلمان صلح حدیبیہ سے  
 واپس لوٹے تو ان میں ایک عام بددلی پائی جاتی تھی اور وہ اس صلح کو اپنے لئے شکست کے مترادف  
 سمجھتے تھے یہاں تک کہ بعض بعض نے تو صاف لفظوں میں اس کا اظہار بھی کر دیا تھا اس پر قرآن مجید  
 نے یہ مژدہ جانفزا سنایا۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا

ہم نے تو تمہارے لئے عظیم الشان فتح مقدر کر دی

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ حدیبیہ کی صلح کو شکست نہ کہو بلکہ یہ درحقیقت

پیش خیمہ ہے ایک عظیم الشان فتح کا جو فتح مکہ کے نام سے معروف ہو چنانچہ اسی سورۃ میں ارشاد

لَسْتُ خُلْتُ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ

تم اگر اللہ نے چاہا تو مسجد حرام میں ضرور داخل

شَاءَ اللَّهُ أَمِينٌ مُّخْلِطِينَ رُؤُوسَكُمْ

ہو گے مومن و محفوظ کچھ اپنا سر منڈائے ہوں گے

وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ (الفتح)

اور کچھ بال تراشوائے ہوئے اور تم خوفزدہ نہیں ہو گے

پھر غزوہ خیبر میں مسلمانوں کو جو مال غنیمت ملا۔ اس کے متعلق پیشینگوئی بھی اس آیت

میں پہلے ہی کر دی گئی تھی۔

سَيَقُولُ الْخَافُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ

پچھے رہ جانے والے اعراب کہیں گے جب کہ

إِلَى مَغَانِمٍ لِّتَأْخُذُوا بِهَا ذُرُوعًا

تم ماہائے غنیمت کو لینے جاؤ گے گم گم کوچھوڑ

نَتَّبِعُكُمْ (الفتح)

دو کہ ہم بھی تمہارے پیچھے پیچھے چلیں۔

فتح مکہ اور فتح خیبر کی پیشینگوئیوں سے زیادہ حیرت انگیز وہ پیشینگوئی ہے جس میں مسلمانوں

سے تکن اور استخلاف فی الارض کا وعدہ کیا گیا ہے ارشاد ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ

تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور

وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لِيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ

نیک عمل کرتے ہیں اللہ نے ان کو وعدہ کیا ہے

فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ

کہ وہ ضرور ان کو زمین میں ایسا ہی خلیفہ بنا دینگا

مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ

جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو بنایا ہے اور وہ یقیناً

دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ

ان کے اس دین کو جس سے وہ (حذا) راضی

ہو گیا ہے طاقنور بنائے گا۔ (مومنون)

یہ پیشینگوئی اُس وقت کی گئی جب کہ عرب کے دونوں طرف ایران اور روم کی دوزبردست  
 سلطنتیں قائم تھیں اس وقت کسی شخص کو یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ چند برسوں میں ہی ایک  
 وقت وہ آئے گا جب کہ عرب کے بے سرد سامان مسلمانوں کی ایک جماعت ان دونوں کو زیر و  
 زبر کر کے رکھ دے گی لیکن اللہ وعدہ کر چکا تھا اس میں تخلف کس طرح ہو سکتا تھا بالآخر دنیا نے  
 دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے پچاس برس بعد ہی مسلمانوں نے ایک طرف ایرانی  
 سلطنت کی پرانی حسرت و شوکت کو ختم کر کے رکھ دیا اور دوسری طرف مشرقی رومن امپائر کے بہت  
 سے صوبوں پر شام سے لے کر موریشش کے انتہائی سرے تک قبضہ کر لیا۔ رب العزت نے  
 مسلمانوں سے اتخلاف فی الارض کا جو وعدہ کیا تھا وہ نصف صدی میں ہی اس طرح پورا ہوا کہ  
 خلافتِ عظمیٰ کا دائرہ اقتدار مشرق میں سندھ تک پھیل گیا مغرب میں بحر اٹلانٹک اور شمال میں  
 اس کا پرچم عظمتِ اناطولیہ کے قلب و جگر پر لہرایا۔

مسلمانوں کی ان حیرت انگیز فتوحات پر تبصرہ کرتے ہوئے گبن صاحب قرآن کی  
 پیشین گوئی کی صداقت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

”شاید اب قرآن کی تفسیر آکسفورڈ کے اسکولوں میں پڑھائی جائیگی اور اس کے ممبروں  
 سے مقدس لوگوں کے لئے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وحی کی صداقت اور اس کے تقدس کا اظہار  
 کیا جائے گا۔“

علاوہ ازیں یہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے

إِنَّا مَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ  
 ہم نے ہی قرآن نازل کیا اور ہم ہی اس کی  
 حفاظت کریں گے۔

## نسرما کر قرآن کی حفاظت کا۔ اور

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ      اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا

فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا جو وعدہ کیا تھا وہ کس طرح حرف پورا ہوا کر رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دینے کے کیسے کیسے منصوبے باندھے گئے اور کیا کچھ سازشیں نہیں ہوئیں اور پھر آنحضرت مسلح فوجیوں کی حفاظت میں یا کسی مضبوط قلعہ میں بھی نہیں رہتے تھے لیکن چونکہ خدا وعدہ کر چکا تھا اس لئے دشمنوں کی تمام تدبیریں ناکام رہیں اور وہ آپ کا کچھ نہ کر سکے۔ اسی طرح قرآن کو دیکھو اس کو نازل ہوئے چودہ سو برس ہونے کو آئے اور اس کے باوجود اس کا حرف حرف بلکہ اعراب اور علامات آیات تک جوں کی قوت محفوظ ہیں اور صرف کاغذوں میں نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کے سینوں میں کیا دنیا کی کوئی اور کتاب بھی اس طرح محفوظ ہے؟

اس اخبار بالغیب میں جو قرآن کے درجہ اعجاز میں سے ایک وجہ ہے۔ قرآن مجید کے وہ قصص بھی داخل ہیں جو انبیاء کرام علیہم السلام یا دوسری اقوام سے متعلق ہیں اور منافقوں کے دلوں میں چھپے ہوئے ان بھیدوں کی اطلاع بھی داخل ہے جن کا ذکر زیادہ تر سورہ تو بہ میں ہے۔ فصاحت و بلاغت قرآن مجید کے اعجاز کی ایک بڑی وجہ اس کا انتہائی فصیح و بلیغ ہونا ہے۔ اس کی تفصیلات میں اگرچہ اختلافات ہیں لیکن اجمالاً یہ عقیدہ ہر قرن اور ہر دور میں جمہور امت کے نزدیک مسلم رہا ہے کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا مثل نہیں لایا جاسکتا۔ قرآن نے خود اپنی فصاحت و بلاغت کا اظہار چند آیتوں میں کیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

لِسَانَ الَّذِي يُلُودِ الْيَوْمِ      جس کی طرف یہ کفار نسبت کرتے ہیں اس کی

أَعْجَمِيَّ وَهَذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ      زبان تو عجمی ہے اور یہ قرآن کی زبان نہایت

داخ اور صاف عربی ہے۔

(مخمل)



قرآن عربی زبان میں ہے جس میں کوئی کجی نہیں ہے  
 قرآن نامعاً بیا غیر ذی عوج (زم)  
 قرآن مبین  
 نہایت واضح اور صاف قرآن  
 یہ قرآن ایسی زبان میں ہے جو دعا کو وضاحت  
 بلسان عربی مبین  
 سے بیان کرتی ہے۔

وضاحت و بلاغت ذوقی و وجدانی چیز ہے | اس بحث کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اگرچہ علماء معانی و بیان نے وضاحت و بلاغت اور ان کے مدارج و مراتب کی تعین کے لئے بڑی محنت اور تلاش و جستجو سے اصول و قواعد دونوں کئے ہیں اور ان کی تشریح و توضیح میں نہایت طول طویل نہیں کر کے ذہانت و طباعی کی داد دی ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ باعتبار وضاحت و بلاغت دو کلاموں میں موازنہ و ترجیح کا کام اہل لسان کے ذوق و وجدان سے ہی متعلق ہے اور اس قضیہ میں ان کے ذوق کا فیصلہ ہی دلیل قاطع کا حکم رکھتا ہے۔ چنانچہ کتاب الطراز کے مصنف وضاحت کلام پر طویل بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

یہ جو کچھ بھی ہم نے کہا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی لفظ کے حسن یا لطف کے فیصلہ کا دار و مدار ذوق سلیم اور طبع مستقیم پر ہے قواعد و ضوابط پر نہیں جیسا کہ لوگوں نے سمجھا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہی چند حروف ہیں کہ اگر ایک خاص ترتیب سے ان سے ایک لفظ بنایا جائے تو وہ انتہائی غیر فصیح اور رکبک ہوتا ہے لیکن اگر انہیں حروف سے اس ترتیب کو بدل کر کسی اور ترتیب سے ایک لفظ بنایا جائے تو وہ فصیح تر ہو جاتا ہے۔ مثلاً منع اور علم۔

جب خود اہل زبان بلاغت کا ذوق رکھنے میں یکساں نہیں ہوتے تو غیر اہل زبان کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ قرآن کے وجہ اعجاز کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

”اذاں جملہ درجہ علیا از بلاغت کہ مقدور بشر نباشد و چون ما بعد عرب اول آمدہ ایم بحسنہ  
 آں نمی تو انیم رسید لیکن این قدری دانیم کہ استعمال کلمات و ترکیبات عذیبہ جذلہ بالطا  
 و عدم تکلف قدرے کہ در قرآن می یابم در پیچ قصیدہ از قصائد متقدمین و متاخرین نبی  
 یابم و این امریت ذوقی کہ چہرہ از شعر آرا بخوبی میتوانند دانست و عوام آں ذائقہ  
 ندارند“

اسی بنا پر امام راعب اصغہانی نے بالکل درست کہا ہے کہ جو لوگ و حدان صحیح اور  
 ذوق سلیم رکھتے ہیں ان کے لئے اعجاز قرآن کی کسی دلیل کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں وہ خود  
 ہی اس کے قائل ہو جاتے ہیں ان کے برخلاف جو لوگ اعجاز قرآن کی دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں  
 وہ دو قسم کے اشخاص ہوتے ہیں ایک وہ جو ناقص ہونے کی بنا پر کلام الہی اور کلام بشری میں امتیاز  
 نہیں کر سکتے اور دوسرے وہ جو نقص کے باوجود غنا بھی رکھتے ہیں۔

قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کا اندازہ ان لوگوں کو ہی ہو سکتا ہے جو سلامت  
 ذوق اور استقامت طبع کے ساتھ عرب کے سائذہ شعر و سخن کے کلام کا مطالعہ کئے ہوئے ہوں  
 اور جنہوں نے علم معانی و بیان پر اسائذہ متقدمین کی کتابوں کا مطالعہ کر کے اپنے ذوق و حدان  
 کو نچتہ اور نشائستہ بنا لیا ہو۔

۱۷ کتاب الذریعہ ص ۷۰

۱۸ الفوز الکبیر ص ۳۸

۱۹ ہمارے منہد و نشان کے مدارس عربیہ میں ان فنون کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ اس مقصد کیلئے بالکل  
 ناکافی ہیں ان کی جگہ اگر کتب ذیل پڑھائی جائیں تو خاطر خواہ فائدہ ہو سکتا ہے (۱) اسرار البلاغہ و دلائل الاعجاز  
 امام عبدالقادر جرجانی (۲) کتاب الصنائعین ابو ہلال العسکری (۳) الحفصائص ابن جنی (۴) اساس البلاغہ زعشر  
 (۵) کتاب لطر از یحییٰ بن حمزہ (۶) کتاب الفوائد حافظ ابن قیم (۷) مغنی اللیبیب ابن ہشام

بلغار و شعرا عرب پر قرآنی بلاغت کا اثر | جو لوگ اس نعمت خدا داد سے بہرہ وافر رکھتے ہیں وہ خواہ  
 مسلمان ہوں یا غیر مسلم بہر حال اس پر مجبور ہیں کہ بلاغت و فصاحت کے اعتبار سے بھی قرآن کے اعجاز  
 کے قائل ہوں۔ چنانچہ تاریخ ادبیات عرب کا مطالعہ کیا جائے تو اس قسم کے صد ہا واقعات ملتے  
 ہیں کہ لوگوں نے قرآن مجید کی ایک آیت سن کر ہی اسکے وحی الہی ہونے کا اقرار کر لیا ہے۔  
 عتبہ بن ربیعہ قریش کا بڑا صاحب اثر و رسوخ شخص تھا۔ بدر کی جنگ میں مارا گیا ہے  
 ایک مرتبہ اہل قریش کے ساتھ ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم الگ  
 مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ عتبہ اہل مجلس کے مشورہ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
 کے پاس آیا ارادہ یہ تھا کہ آپ کو مال وغیرہ کا لالچ دے کر دعوتِ اسلام سے باز رکھنے کی کوشش  
 کرے عتبہ اپنی تقریر ختم کر چکا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ”حَمْدٌ تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“  
 کی سورۃ کا کچھ حصہ تلاوت کر کے سنایا۔ عتبہ نے اپنے دونوں ہاتھ پس پشت لیجا کر ان پر ٹیک لگالی  
 اور نہایت خاموشی سے سنتا رہا۔ سورۃ کی تلاوت کرتے کرتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آیت سجدہ  
 تک پہنچے تو آپ نے سجدہ تلاوت کیا اور پھر عتبہ سے مخاطب ہو کر فرمایا ابو الولید کیا اب بھی تم اپنے  
 اسی پرانے خیال پر جمے ہوئے ہو؟ عتبہ یہ سن کر اپنے لوگوں میں واپس چلا آیا لیکن قرآن مجید  
 کی آیات کو سننے کا اثر اس کے چہرہ بشرہ سے ظاہر ہو رہا تھا۔ اور باب مجلس نے جب اس سے  
 پوچھا تو کہنے لگا۔ خدا کی قسم میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے کہ اس جیسا آج تک سنا ہی نہیں تھا بخدا  
 یہ کلام ہرگز ہرگز نہ شعر ہے نہ کوئی جادو ہے اور نہ کسی کا ہن یا نجومی کا قول ہے۔“ اے قریش  
 فالو تم میری بات مانو۔“

انیس قبیلہ غفار کے بڑے نامور شاعر تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہر چائے کر

چھپے چوری مکہ آئے اور آنحضرتؐ کی زبان مبارک سے قرآن مجید کی کچھ آیتیں نکر واپس گئے ان کے بھائی حضرت ابو ذر نے پوچھا کہ تم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسا پایا؟ وہ بولے "لوگ کہتے ہیں کہ وہ شاعر ہیں ساحر ہیں یا کاہن ہیں، لیکن میں نے کامیوں کا کلام سنا ہے اور شعر کے اسالیب و طرق سے بھی واقف ہوں میں نے محمد کے کلام کو ان سب پر منطبق کر کے دیکھا۔ خدا کی قسم وہ ان سب سے بالکل الگ اور ایک اور ہی عجیب طرح کا کلام ہے۔ بخدا محمد سچے اور قریش کے لوگ جھوٹے ہیں۔"

ولید بن مغیرہ بڑا دولت مند اور قریش میں فصاحت کا امام تھا ایک مرتبہ اس نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر کچھ سنانے کی درخواست کی۔ آنحضرتؐ نے "إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ" والی آیت آخر تک تلاوت فرما کر سنائی۔ ولید اس درجہ متاثر ہوا کہ اس نے مکرر تلاوت کرنے کی فرمائش کی جب آنحضرتؐ دوسری مرتبہ بھی سنا چکے تو ولید بولا "خدا کی قسم اس کلام میں کچھ اور ہی شیرینی ہے اور تازگی بھی نئی قسم کی ہے۔ اس نخل کا اعلیٰ حصہ ثمر آور ہے اور اس کا حصہ زیریں مضبوط تنہ ہے اور کوئی بشر اس جیسا کلام نہیں کر سکتا۔"

شاہ حبش کے متعلق مشہور ہے ہی کہ جب اس کے دربار میں حضرت جعفر نے سورہ مریم کی تلاوت کی تو وہ اس درجہ متاثر ہوا کہ بیاختہ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے پھر بلا خواہ کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پر تو ہیں۔"

قبیلہ اُرُوکے ایک شخص ضاد تھے جھاڑ چوک کا کام کرتے تھے ایک مرتبہ مکہ آئے اور یہاں کے لوگوں سے سنا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو (نغز بالشر) جنون ہو گیا ہے ضاد یہ سنا

کر کے کہ میں آپ کا علاج کروں گا۔ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرتؐ نے ان کے سامنے مختصر سی حمد اور کلمہ شہادت پڑھا، صنادید پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا اور تین مرتبہ آپ سے اس کا اعادہ کرایا اور پھر کہا "میں نے کانہوں، جادوگوں اور شاعروں ان میں سے ہر ایک کا کلام سنا ہے لیکن آپ جیسے کلمات تو سننے ہی نہیں یہ کلام تو سمندر کی گہرائیوں تک اتر جاویگا اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس پر بیعت کر لی۔"

عمر بن جوح قبیلہ بنو سلمہ کے نامی گرامی سردار تھے ان کے بیٹے معاذ اسلام قبول کر کے واپس آئے تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پوچھا کہ تم نے آپ سے کیا سنا ہے معاذ نے سورہ فاتحہ الحمد شرب العلیین سے لیکر الصراط المستقیم تک پڑھ کر سنائی عمر بن جوح پر پڑا گہرا اثر پڑا کہنے لگے "یہ کلام تو بڑا ہی عمدہ ہے اور خوب ہے کیا آپ کا سب کلام ایسا ہی ہے بولے "جی ہاں! بلکہ اس سے بھی عمدہ" اس کے بعد وہ مسلمان ہو گئے۔"

جس زمانہ میں قرآن مجید نازل ہوا عرب کا بچہ بچہ شعر و شاعری کا ذوقِ حداد اور کھتا تھا آتش بیان خطبا قبیلہ قبیلہ میں موجود تھے جو کسی بڑے سے بڑے شاعر و خطیب کے کلام کو نظر میں نہیں لاتے تھے فصاحت و بلاغت کا جو ہر ایک ایک شخص کے خمیر میں پڑا ہوا تھا اور وہی ان کے لئے سب سے بڑا سرمایہ نازش و افتخار تھا اب غور کرو فصاحت و بلاغت اور شعر و خطابت کی اس گرم بازاری کے عہد میں مکہ کی خاکِ پاک سے ایک نبی امی کا ظہور ہوتا ہے وہ چالیس سال تک خاموش زندگی بسر کرنے کے بعد یکایک ایک نئے پیغام کی دعوت لے کر اٹھتا ہوا اور اس دعوت کی سچائی کے ثبوت میں ایک کلامِ قرآن پیش کرتا ہے اس کلام کو پیش کر کے وہ عرب کے

۱۷ صحیح مسلم باب الاقتصاد فی الصلوٰۃ والخطبہ

نامور شاعروں، شعلہ نشاں مقرروں اور خطیبوں اور میدان فصاحت و بلاغت کے شہسواروں کو ایک مرتبہ نہیں بلکہ بار بار نرمی اور لین سے نہیں بلکہ نہایت سخت زبرد تو بیخ کے انداز میں پھر یکے بعد دیگرے نہیں بلکہ سب کو ایک ساتھ چیلنج دیتا ہے کہ اگر یہ لوگ اس کے دعویٰ کی تکذیب میں پختے ہیں تو سارے قرآن کا نہیں اس کے کسی ایک جز کا ہی مثل لاکر دکھا دیں۔

پھر کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس بنی امی کی مخالفت اور خصومت میں کیا کچھ نہیں کہا اور کیا گیا لیکن یہ عرب کے نامور خطبا اور شعرا سب مل کر بھی قرآن مجید کی تحدی کے جواب میں اس کی کسی ایک سورۃ کا مثل لاسکے ہرگز نہیں سب کی زبانیں گنگ تھیں اور قوت فصاحت و بلاغت مفلوج پھر جو لوگ ان میں پاک باطن اور صاف سینہ تھے انہوں نے کھلے لفظوں میں اپنی شکست و عجز کا اقرار کیا اور قرآن کے اعجازِ بیان سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ انہوں نے شاعری کو ہی خیر باد کہہ دیا۔ لیبید عرب کے مشہور شاعر ہیں جن کا ایک قصیدہ سب سے متعلقہ میں بھی شامل ہے اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا۔ صرف ایک دو شعر منقول ہیں ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ان سے شعر سننے کی فرمائش کی تو انہوں نے جواب دیا جب خدا نے مجھ کو تبرا اور آل عمران سکھائی تو اب مجھے شعر کہنا موزوں نہیں ان کے علاوہ حسان بن ثابت کعب بن مالک عبداللہ بن رواحہ طفیل بن عمرو زید الخلیل کعب بن زہیر شمس اسود بن سرح وغیر ہم عرب کے نامی گرامی شعرا تھے لیکن قرآن مجید کے دعویٰ اعجاز کے سامنے سب کی گردنیں خم ہو گئیں اور بجائے مخالف ہونے کے اسلام کے زبردست حامی بن گئے۔

قرآن مجید کے اعجازِ بیان کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی صاحب ذوق کے سامنے اسکی کوئی آیت تلاوت کی جائے اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کلام کا قائل کون ہے تب بھی لامحالہ سننے والے پر

اس کا اثر ضرور ہوگا تاریخ اور ادب کی کتابوں میں جستجو کی جائے تو اس قسم کے سینکڑوں واقعات مل سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک اعرابی نے ایک شخص سے "فَاَصْدَعْ بِأَوْامِرِشَاؤُفُورًا سُرْبُجُودُ" ہو گیا اور بولا میں نے اس وقت اس کلام کی فصاحت و بلاغت سے ہیبت زدہ ہو کر سجدہ کیا ہے ایک اعرابی نے کسی شخص سے قرآن پاک کی آیت "فَلَمَّا اسْتِيسَا سُوَامِنَا خَلَصُوا مَجِيَّاسِي تُوْبُوْبِلَا" میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی مخلوق اس جیسا کلام بولنے پر قادر نہیں ہے ۱۱

ایک دفعہ نبی لعنت کے مشہور امام صہبی نے ایک سن پچی کو دو شعر پڑھتے ہوئے سنا شعر سن کر بولے "اللہ اکبر! یہ شعر کس درجہ فصیح و بلیغ ہیں" لڑکی بولی "کیا اللہ تعالیٰ کے ارشاد

وَاَوْحَيْنَا اِلَىٰ اِمِّمُوسَىٰ اِنْ اَوْصِيْنَا  
اھم نے موسیٰ کی ماں کو وحی بھیجی کہ تم اس کو دو  
فَاِذَا خِطَبْتِ عَلِيًّا فَالْقِيَّةِ فِي  
پلاکار جب تم کو اس کے متعلق خوف ہو تو اسے  
الْيَسْرِ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي اِنَّا  
دریا میں ڈال دو اور نہ خوف کرو نہ غم ہم پھر  
رَاٰعِدَةُ اِلَيْكَ وَجَاعِلُوهُ مِنْ  
موسیٰ کو تمہاری طرف لوٹادیں گے اور اس کو  
الْمَسْئِلِيْنَ  
رسول بنا میں گئے۔

کے بعد بھی کوئی کلام اب اس کا مستحق ہے کہ اسے فصیح کہا جائے۔ تم دیکھتے نہیں کہ اس ایک آیت میں کس خوبی سے اللہ نے دو امرا صنعیہ اور القیہ دونہی لَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي دو خبریں اِنَّا رَاٰعِدَةُ اور جَاعِلُوهُ جمع کر دی ہیں۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں سو رہے تھے کہ اتنے میں روم کی فوج کا ایک کمانڈر انجیف آیا اور کلمہ تشہد پڑھنے لگا۔ حضرت عمرؓ نے اس کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ میں نے مسلمان قیدیوں سے ایک قیدی کی زبانی یہ آیت سنی وَمَنْ لَطِعَ اللہ

وَرَسُولُهُ وَمُخَشَّشَ اللَّهِ وَيَقْتُلِ الْإِيْمَةَ اور اس سے اس درجہ متاثر ہوا کہ آپ کے سامنے اسلام قبول کرتا ہوں۔

ان واقعات کے علاوہ صحابہ کرام کے حالات زندگی پر جو تو معلوم ہو گا کہ قرآن مجید ان پر کیا اثر کرتا تھا حضرت عمرؓ کے متعلق کون نہیں جانتا کہ انھوں نے اپنی بہن فاطمہ سے سورۃ سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ سنی تو یہ حال ہوا کہ یا تو سخت غصہ میں بھرے ہوئے تھے اس سورت کو سنتے ہی ان کا حال دگرگوں ہو گیا ایک ایک لفظ دل پر تیر و تان کا کام کرتا تھا یہاں تک کہ جب فاطمہ آمنوا باللہ ورسولہ پر پہنچی تو وہ بے ساختہ پکار اٹھے اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمد رسول اللہ

حضرت عثمان بن مظعون نے جب سورہ نحل کی یہ آیت سنی۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ  
وَأَيُّعِذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ  
الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ  
لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ

بے شبہ خدا عدل اور احسان اور قرا تباروں  
کے ساتھ حُرُن سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے اور  
بدکاری اور بری باتوں اور ظلم سے روکتا ہے  
تا کہ تم اس سے نصیحت پذیر ہو۔

تو انھوں نے فرمایا اب اس وقت میرے دل میں ایمان جاگزمین ہو گیا اور میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے لگا۔

حضرت جبیر بن مطعم اسیران بدر کو چھڑانے آئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سورہ طہ کی چند آیتیں سنی تو ان کا دل اڑنے لگا۔ حضرت طفیل بن عمرو دوسی کے

۱۵ یہ سب واقعات شرح زرقانی ج ۵ ص ۱۰۳ و ۱۰۴ سے ماخوذ ہیں

۱۶ منہل احمد بن حنبل ج ۱ ص ۳۱۸ ۱۷ صحیح بخاری تفسیر سورہ طہ



مکانوں میں اتفاقیہ قرآن کی چند آیتیں پہنچ گئیں تو حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ جس سے مجلس سے بیس آدمیوں کی ایک جماعت خدمت اقدس میں حاضر ہوئی آپ نے ان کو قرآن مجید کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا تو ان کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔ طائف کے سفر میں حضرت خالد الحدادی نے آپ کی زبان سے

وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ  
آسمان کی قسم اور رات میں آنے والے کی

قسم

سنی تو اسی وقت پوری سورۃ دل میں اترتی چلی گئی اور آپ مسلمان ہو گئے۔

افراد و اشخاص کا کیا ذکر ہے صحابہ کی تو جماعت ہی قرآن مجید کے اثر سے متاثر ہوئی حضرت ابو عبیدہ حضرت ابوسلمہ اور حضرت ارقم بن ابی ارقم اسی کتاب الہی کی معنایطیسی کشش سے کھنچ کر اسلام لائے تھے۔

پھر اسلام لانے کے بعد بھی صحابہ کا یہ حال تھا کہ ایک ایک آیت پر کلام الہی کی نسبت سے آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی جو خود حامل وحی تھے بسا اوقات کسی کی زبان سے قرآن مجید سن کر رونے لگتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے قرأت شروع کی تو چشم مبارک سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔

قرآن کی یہ معجزانہ فصاحت و بلاغت ان لوگوں کو بھی متاثر کئے بغیر رہی جو اہل زبان

۱۵ طبقات ابن سعد تذکرہ طفیل بن عمرو الدوسی

۱۶ سیرۃ ابن ہشام

۱۷ مسند امام احمد بن حنبل ج ۴ ص ۲۲۵

۱۸ اسد الغابہ تذکرہ ابوسلمہ

نہ تھے اور ساتھ ہی غیر مسلم بھی تھے ڈاکٹر ٹیلر، موسیو سدو، اگن، ڈیون پورٹ، ٹالسائی، کارلایل، ہنری دی کاسٹری، راڈویل ان لوگوں نے بھی قرآن مجید کے اسلوب بیان اور اس کی تاثیر و تخییر کا احترام صاف لفظوں میں کیا ہے۔

ژان تراک روسونے اپنی ایک تحریر میں قرآن مجید کی تاثیر اور اس کے اعجاز کا ذکر ایک عجیب پیرایہ میں کیا ہے جو آج کل کے بعض مدعیانِ عربی داں پر پورے طود پر صادق آتا ہے وہ لکھتا ہے:

”بعض لوگ ہیں جو عربی برائے نام ہی جانتے ہیں وہ جب قرآن پڑھتے ہیں تو ہنسنے لگتے ہیں۔ لیکن اگر اس قسم کے لوگوں کو اس بات کا موقع مل جاتا کہ وہ براہِ راست محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس حد درجہ اثر انگیز اور دلوں میں گھر کرنے کی والی زبان کو سنتے تو بے شبہ یہ لوگ زمین پر سجدہ میں گر پڑتے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پکار کر کہتے کہ ”اے بنی“ آپ ہمارا ہاتھ پکڑ لیجئے۔ پھر آپ کا جہاں جی چاہے ہم کو لے چلئے۔ خواہ شرف و مجد کی طرف یا خطروں اور ہلاکتوں کی جانب ہم تو اب آپ کی وجہ سے موت کو بھی محبوب رکھنے لگے ہیں۔“

عدم اختلاف | قرآن نے اپنے اعجاز کی ایک دلیل عدم اختلاف و تناقض کو بھی بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَلَوْ كَانُ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهَا اخْتِلَافًا كَثِيرًا  
اگر قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔

عام مصنفین کی بڑی بڑی اہم تصنیفات سے قطع نظر یہ دیکھو کہ دوسرے مذاہب کی

۱۵ دیکھو تفصیل کے لئے اسلام و الحضارة العربیہ جلد اول اور ادب العرب

۱۵ بحوالہ الاسلام والحضارة العربیہ ج ۱ ص ۶۹

خود الہامی اور آسانی کتابوں کا کیا حشر ہوا؟ ایک اڈیشن دوسرے اڈیشن سے مختلف ہے لیکن قرآن نے اپنی صداقت میں جس دلیل کو پیش کیا تھا وہ دشمنوں کی ہزار کوششوں کے باوجود آج تک آفتاب نیروز کی طرح روشن و ظاہر ہے تقریباً تیس تیس برس پہلے ڈاکٹر منگانے قرآن مجید کے کسی نئے نسخے کے ملنے کی اطلاع سے دنیا میں ایک تہلکہ برپا کر دیا تھا۔ لیکن باخیر اصحاب کو معلوم ہے کہ مصر اور ہندوستان کے علماء نے کس طرح ڈاکٹر صاحب کے بے بنیاد دعویٰ کو باطل محض کر دکھایا تھا۔

**احکام و شرائع** | خود قرآن کے بیان کے مطابق اس کے اعجاز کی ایک وجہ اس کے تشریحی احکام و مسائل ہیں قرآن نے بار بار اپنے آپ کو ہدایت نواز۔ دلیل روشن۔ رحمت بصیرت اور محبت کہا ہے غور کر قرآن مجید کے اعجاز کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ چالیس سال کی خاموش زندگی کے بعد یکایک ایک امی ایک صحیفہ مقدس لئے ہوئے دنیا کے سامنے ظاہر ہوتا ہے اور اس صحیفہ سے وہ جاہلوں کو دانشوران روزگار اور اونٹ چرانے والے بدویوں کو بہترین تہذیب و تمدن اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ کا پیکر اتم بنا دیتا ہے۔ اصول احسن و قانون حکمت و فلسفہ اور محاسن علم و عمل کی بزم کا گوشہ گوشہ اس کے پر تو قدس سے بقعہ نوز بن جاتا ہے۔

**قرآن کا محکم دستور عمل** | جو قوانین و ضوابط قرآن نے پیش کئے وہ اس قدر صحیح اور مکمل ہیں کہ آج علوم و فنون کی بڑی گرم بازاری اور انسانی عقل و خرد کی حیرت انگیز ترقی و بلند پروازی کے باوجود معاشرت تہذیب و تمدن نکاح و طلاق بیع و شراقتیم میراث اور عام معاملات و اخلاق کے قوانین و شرائع قرآنی قوانین کے مقابلہ میں سالہا سال کے تجربوں کے بعد نام کام ہی ثابت ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ دوسری قوموں کو جب کبھی اپنی سوشل اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ انہوں نے اپنی پرانی فرعونہ یا اصلی روایات مذہبی کو چھوڑ کر اسلام کے احکام و قوانین کے دامن ہی میں پناہ لی ہے۔

اس پر اگر تفصیل سے کلام کیا جائے تو ایک مستقل کتاب درکار ہے مہلاً اس قدر لکھ دینا کافی ہوگا

یورپ نے بہت دنوں تک طلاق کا مذاق اڑایا۔ تعدد ازدواج پر طعنہ زنی کی اور مسلمانوں کے جہاد کو وحشت اور بربریت کہا۔ مگر آخر کار اس کو خود طلاق کا قانون وضع کرنا پڑا۔ پھر یہ دیکھو کہ اسلام نے طلاق کا اختیار مرد کو دیا تھا نہ کہ عورت کو۔ کیونکہ عورت فطرتاً بہت زود رنج اور جلد متاثر ہو جانے والی ہے۔ یورپ والوں نے طلاق کو مشروع تو کیا لیکن غلطی یہ کی کہ اس کا اختیار عورت کو دیدیا گیا پہلے یہ لوگ تفریط میں مبتلا تھے اور اب افراط میں مبتلا ہو گئے۔ اس کا جو کچھ بھی نتیجہ ہوا آج ہر باخبر شخص اس سے ناواقف نہیں ہے کہ طلاق کی کثرت نے کس طرح ان لوگوں کی معاشرتی زندگی ویران و تباہ کر رکھی

ہندوؤں میں عقد بیوگان کا رواج نہیں تھا۔ مذہبی اعتبار سے وہ اسے بہت بڑا پاپ سمجھتے تھے۔ لیکن جب اس ممانعت نے ان کی سوسائٹی میں چند در چند اخلاقی معائب پیدا کرنے اور ان کو اپنی اصلاح کا خیال ہوا تو انجام کار انھیں وہی کرنا پڑا جس کا اعلان اب سے ساڑھے تیرہ سو سال سے بھی زیادہ مدت پہلے ایک بنی امی کی زبان سے ہو چکا تھا یہی حال میراث کا ہے۔ منہدوؤں میں بیٹی کو ترکہ پداری سے کوئی حصہ نہیں ملتا تھا لیکن اب جن منہدو ریاستوں میں سماجی اصلاح کی کوششیں ہو رہی ہیں وہاں برلا کہا جا رہا ہے کہ بیٹی کو بھی حصہ ملنا چاہیے اب اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ قانون قرآنی کے مناسب و متوازن ہونیکا یہ عالم ہے کہ وہ بیٹی کو باپ کے ترکہ میں سے حصہ دلاتا ہے لیکن بیٹے سے نصف اس میں حکمت یہ ہے کہ بیٹے کو کسب معاش کے لئے کارگاہ زندگی میں تنگ و دو کرنی پڑتی ہے اور تمام بار اس کو ہی اٹھانا پڑتا ہے یہی بیٹی تو اس کو کمانے کے لئے خود کچھ نہیں کرنا پڑتا بلکہ اس کا نان نفقہ شادی کے بعد شوہر کے ذمہ ہوتا ہے۔

یورپ نے تعدد ازدواج پر کیا کچھ طعن نہیں کیا۔ لیکن اب خود وہاں کے بڑے بڑے حکما اور مفکرین تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام میں تعدد ازدواج کی اجازت بہت سے اخلاقی فواحش و مفاہد کے اسناد کا کامیاب ذریعہ ہی اسی طرح یورپ نے "جہاد" کو وحشت اور زندگی کہا۔ لیکن اب دیکھو کہ خود

یورپ میں کیا ہو رہا ہے کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اب دہلی زبان سے یورپ نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ جب تک دنیا فتنہ و شر اور خواہشات نفسانی و اغراض فاسدہ کی آماجگاہ ہے کسی حق کی حفاظت کیلئے تلوار سے کام لینا ناگزیر ہے۔ البتہ ہاں فرق استقدر ضرور ہے کہ قرآن میں جس جنگ کا حکم ہے وہ وہی جنگ ہے جو حق کی حمایت و حفاظت کے لئے لڑی جائے نسلی اور قومی عصیت کی برتری قائم رکھنے کیلئے جنگ نہ صرف یہ کہ جائز نہیں ہے بلکہ بڑی معصیت ہے اور یہاں انجیل کے پیرو جو کچھ کر رہے ہیں وہ محض اپنی قومی فوقیت کو برقرار رکھنے اور دوسرے ملکوں اور قوموں کو اپنے دام حکومت میں پھنسانے کے لئے کر رہے ہیں۔ پس غور کرو کہ کیا یہ قرآن کا اعجاز نہیں ہے کہ وہ جو دستور العمل اور نظام زندگی پیش کرتا ہے وہ ایسا جامع محکم اور ناقابل تغیر و تبدل ہے کہ صدیوں کے گزر جانے اور عقل و فکر کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود اسکی کسی ایک دفعہ میں بھی کوئی ترمیم و تہنیک نہیں ہو سکتی اور اس بنا پر مسلمان اس بات کے محتاج نہیں ہیں کہ اپنی کسی سوشل اصلاح کیلئے وہ کسی دوسرے قانون و نظام سے درپوزہ گری کرے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی کسی جماعت نے قرآن کے دستور کو منحرف ہو کر کسی قوم کی نقالی کی اس نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں اسکے برعکس دوسری قوموں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی سوسائٹی کی اصلاح کیلئے جب کبھی غور و فکر سے کام لیتی ہیں انھیں مجبوراً اپنی دیرینہ روایات مذہبی و سماجی کو پس پشت ڈال کر اسلام کے دستور سے ہی بھیک مانگنی پڑتی ہے۔ پس کیا کوئی طاقت ہے جو قرآن کے دعویٰ

کِتَابٌ اُحْكِمَتْ آيَاتُهُ

ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں مضبوط ہیں

اور جَعَلْنَاكَ نُورًا مُّهِدًىٰ بِمَنْ نَّشَاءُ

مجھ سے جو نور بنایا ہے اور چاہے جسے ذریعہ سواستہ دکھائیں

کی ذرا بھی تکذیب و تغلیط کیلئے "سورہ قصص میں قرآن مجید اپنی اس حیثیت کو بطور تحدیٰ اس طرح بیان کرتا ہے

قُلْ نَارُ الْكِتَابِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ هُوَ

کہہ دیجئے اے محمد تم اللہ کے پاس سے کوئی ایسی کتاب آجوان دلاؤ

أَهْدَىٰ مِنْهَا ۚ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ

(قرآن اور توراہ) سے زیادہ ہدایت والی ہو ہیں اسکا تعلق کر لو اگر تم سچے ہو

قرآن کی روح و تشبیہ | جیسا کہ شروع میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید سرِ پانور اور حسن و جمال پر سطور بالا میں جو چند وجوہ اعجاز بیان کئے گئے ہیں وہ صرف اس کے ایک رخ پر نوز کی ناتمام سی تشریح کرتے ہیں غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کو ایک مقام پر روح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَكُنَّا لَكَ آوْحِينَآ إِلَيْكَ رُوحًا  
مِنْ أَمْرِنَا (زخرف) بطور وحی نازل کیا۔  
اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے آپ پر روح کو

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح روح ایک حقیقت ثابتہ ہے اسکے افعال و آثار ہر شخص پر عیاں ہیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ مادی اور جسمانی زندگی کا قیام روح کے اتصال بالجسم پر موقوف ہے۔ لیکن اسکے باوجود آج تک روح کی حقیقت و ماہیت متین نہیں کی جاسکی اسی طرح قرآن مجید اخلاق و حسن عمل کی روح ہے اس پر عمل کرنے کے بعد ہر شخص اس کے اثرات و نتائج میں طور پر محسوس کر سکتا ہے لیکن باہم کوئی شخص اس کی پوری حقیقت و کنہ سے واقفیت حاصل نہیں کر سکتا۔

حضرت علیؑ کا ارشاد | حضرت علیؑ نے قرآن مجید کی نسبت ایک نہایت بلیغ کلام کیلئے ہم درجہ اعجاز کی بحث کو اس پر ہی ختم کرتے ہیں۔

”قرآن علمائے پارس کے لئے سامان سیرابی ہے اور فقہاء کے دلوں کے لئے افضل بہار وہ صلحا کے لئے ایک جادہ مستقیم ہے اور ارباب بحث و نظر کیلئے برہان قوی وہ طلبہ علوم کیلئے علم کا انمول خزانہ ہے اور ارباب حکومت کے واسطے ایک محکم دستور اساسی وہ اصحاب روایت کے لئے حدیث جانفزا ہے اور تشنگان تحقیق و جستجو کے لئے امید و رجاء کا سب سے بڑا سہارا (بیخ البلاغۃ)

حق کی حجت تمام ہو چکی اب اس پر بھی اگر کوئی سرگشتہ و ادوی ضلالت و گمراہی ہدایت کی روشنی نہیں پاتا تو نہیں کہا جاسکتا کہ

فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَكَ يُؤْمِنُونَ  
اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے لہ

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہم نے کتاب کے موضوع بحث کی مناسبت سے اعجاز قرآن پر مختصر گفتگو کی ہے ورنہ اس بحث کے لئے ایک مستقل ذخیرہ کتاب درکار ہو کر بی بی بی میں خاص اسی موضوع پر ایک عمدہ اور مفصل کتابیں موجود ہیں۔

## قرآن مجید کا اسلوب بیان اور بعض عیسائی مصنفین

کتاب کے آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض ان اعتراضات اور ان کے جوابات کا بھی ذکر کر دیا جائے جو بعض عیسائی مصنفین نے قرآن پر کئے ہیں ان لوگوں کا ایک عام اعتراض یہ ہے کہ نزول قرآن سے پہلے عرب میں بعض پر زور خطیب مثلاً قس بن ساعدہ اور شعراء مثلاً امیہ بن الصلت ایسے موجود تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے ان کے خطبے اور اشعار سنے تھے اور ان لوگوں کے کلام میں بعض چھوٹے چھوٹے فقرے قرآن کی چھوٹی چھوٹی آیتوں کے انداز کے پائے جاتے ہیں عیسائی مصنفین اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کا اسلوب انھیں <sup>لیا ہے</sup> قس بن ساعدہ کے خطبات اور امیہ بن الصلت کے اشعار عربی ادب و محاضرات کی کتابوں میں بکثرت منقول ہیں انکی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے یہاں ان کے نقل کر سکی ضرورت نہیں۔ اس اعتراض کے جواب میں سب سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ قس بن ساعدہ اور امیہ کے جن اشعار کو پیش کر کے قرآن مجید کے اسلوب پر اعتراض کیا جاتا ہے انکی نسبت تحقیق یہ ہے کہ وہ سب موضوع ہیں۔ اس بنا پر وہ نزول قرآن سے پہلے کا نہیں بلکہ بعد کا کلام ہے اصل یہ ہے کہ نبو امیہ اور عباسیہ کے عہد میں کچھ ایسے لوگ تھے جو خلفاء و امرا سے پیش از پیش انعام حاصل کرنے اور بعض دوسری اغراض کیلئے از خود کلام گھڑ گھڑ کر شعراء و خطباء جاہلیت کی طرف اسے منسوب کر کے نادیتے تھے ان وضایع میں حماد الروایتی اور خلف بن حیان الاموی زیادہ مشہور ہیں ایک مرتبہ ولید بن یزید نے حماد کو پوچھا تمہیں کتنے اشعار یاد ہیں بولا بہت زیادہ اگر آپ سنا چاہیں تو ایک نشست میں ہی ہر حرف تہجی کے سوا طویل تصدیعے صرف شعراء جاہلیت کے سناسکتا ہوں ظاہر ہے کہ حماد کا یہ عجیب و غریب دعویٰ خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ شعراء جاہلیت کی طرف منسوب کر کے جو اشعار سناتا تھا ان میں بہت کچھ اسکے خود ساختہ و پرداختہ اشعار بھی شامل ہوتے ہونگے چنانچہ امحی نے ایک مرتبہ کہا "حماد علم الناس ہے اگر وہ اشعار میں کمی بیشی نہ کرے علامہ یا قوت اطوی لکھتے ہیں کہ

اصحی نے یہ اس لئے کہا کہ حماد کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ وہ شعراز خود کہتا ہے اور پھر شعرا عرب کی طرف اسے منسوب کر دیتا ہے، مفصل لفظی کا قول ہے شعر پر حماد کی وجہ سے ایسی آفت ٹوٹی ہے جس کی کبھی اصلاح نہیں ہو سکتی یہ شخص قدیم شاعروں کے محاورات انداز بیان اور ان کے لغات و اسلوب ادا سے پوری طرح واقف تھا اس لئے ان کے ہی طرز میں شعر کہہ کر انکی طرف منسوب کر دیتا تھا اور سوائے ماہر فن نقاد کے عام لوگوں کو امتیاز نہیں ہو سکتا تھا کہ اس قصیدہ میں کتنے شعرا کے ہیں اور کتنے خود حماد کے کہے ہوئے ہیں، ۱۵۵ء میں انتقال ہوا۔

یہی حال خلف الاحمر کا تھا اس کا باپ ابو بردہ بلال بن ابی موسیٰ الاشعری کا غلام تھا، اشعار کے وضع میں یہ حماد کا ہم پایہ تھا۔ کتاب "ابناء الرواة" میں ہے کہ یہ شخص آنا بڑا حاذق اور ماہر لغت و ادب تھا کہ اپنے اشعار شعرا جاہلیت کے نام سے پڑھ کر سنا دیتا تھا اور بڑے بڑے زباں دانوں کو یہ محسوس نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ اشعار خود اس کے طبع زاد ہیں، ابو الطیب عبد الواحد اللغوی کا بیان ہے

كَانَ خَلْفٌ يَضَعُ الشُّعْرَ وَيُنْسِبُهَا  
إِلَى الْعَرَبِ فَلَا يَعْرِفُهَا  
خلف اشعار وضع کرتا تھا اور انہیں عرب کی طرف منسوب کر دیتا اور (لطف یہ ہے) اسکا پتہ نہیں چلتا تھا

ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ چونکہ قرآن نے اپنی غیر معمولی فصاحت و بلاغت کے باعث تمام عرب کے دلوں کو سحر کر لیا تھا۔ بچہ بچہ کی زبان پر قرآن کی آیتیں تھیں جنہیں بے تکلف بول چال اور تقریر و خطابت میں استعمال کر کے اپنے کلام کو فرین کرتے تھے۔ انداز خیال۔ اسلوب بیان اور طرز کلام و گفتگو سب قرآن مجید کے نظم کلام سے متاثر تھے اس بنا پر یہ قیاس کرنا بالکل صحیح ہے کہ حماد المرادیہ اور خلف الاحمر ایسی وضع و قماش کے لوگ اپنے جن نتائج فکر کو قدیم شعرا عرب کی طرف منسوب کرتے تھے

۱۵ بحم البلدان ج ۱۰ ص ۲۶۵ جدید ادیشن ۱۵ ایضاً ص ۲۶۶

۱۵ بحم البلدان ج ۱۱ ص ۶۸



ان میں قرآن مجید کے اسلوب بیان کی جھلک اضطراری یا اختیاری طور پر نمایاں ہو جاتی تھی۔ ہم  
تمثیلاً تین شعر نقل کرتے ہیں جو بالعموم امیہ بن الصلت کی طرف منسوب ہیں۔ انہیں پڑھو  
اور غور کرو صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے قرآن مجید سامنے رکھ کر یہ اشعار تصنیف کئے ہیں۔

فقلت لہ اذہب بہارون فادعوا      الی اللہ فرعون الذی کان طاغیاً

وقولہ انت رفعت ہذہ      بلاعمد ارفق اذ ابک بانیا

وقولہ انت سوت وسطہا      منیراً اذ ما جنت اللیل ہادیا

ان اشعار کے ساتھ قس بن ساعدہ کے خطبہ کا ایک ٹکڑا بھی ملاحظہ فرمائیے کہتا ہے  
”نبیاً قد حان حینہ و اظلمک اوانہ“ فظنی لمن آمن بہ فہذا وہ ویل لمن خالفہ وعصا  
جو لوگ زبان عربی کا ذوق رکھتے ہیں وہ فوراً محسوس کر لیں گے کہ اس عبارت میں جو الفاظ قرآن  
مجید کے آگے ہیں ان کا دوسرے الفاظ کے ساتھ جوڑ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ٹاٹ میں مخل کے  
کسی ٹکڑے کا پیوند اور اس بنا پر پوری عبارت صاف تباہ ہی ہے کہ یہ نزول قرآن سے پہلے  
کی نہیں بلکہ بعد کی ہے۔

عجب بات یہ ہے کہ پروفیسر مارگولیو تھاس قسم کے مترجمین میں سب سے پیش پیش  
ہیں مگر ایک جگہ خود انہیں بھی اعتراف ہے کہ ”قدیم شاعری کا اکثر حصہ قرآن کے اسلوب پر موضوع  
کیا گیا ہے۔“

اشعار موضوع کی تنقید | جب طرح مسلمانوں میں بعض شریر النفس لوگوں کی کوششوں سے احادیث موضوعہ  
کا چرچا ہوا تو ابابن نے ان کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا اور ایک ایک لفظ اور ہر ایک راوی پر ایسا  
نقد و جرح کیا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا۔ اسی طرح اس قسم کے من گھڑت اشعار

اور خطبے شعراء و خطبا قدیم کی طرف منسوب ہو کر مسلمانوں میں پھیلنے شروع ہوئے تو اگرچہ عوام اصلی اور نقلی میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اصحاب ذوق اور علماء شعر و ادب اس فریب میں نہیں آ سکتے تھے انھوں نے علماء جرح و تعدیل کی طرح ان موضوع اشعار و قصائد کو تنقید کی کسوٹی پر رکھا اور جس میں جہاں کہیں رخنہ نظر آیا اسے بر ملا ظاہر کیا۔ چنانچہ ابن شہام نے اپنی سیرت میں جلال اللہ سیوطی نے الکافی المعنوعہ میں اس نوع کے اشعار و خطبات متعدد مواقع پر نقل کر کے ان پر تنقید کی ہے اور ان کے موضوع ہونے کا پردہ چاک کیا ہے ان کے علاوہ عربی ادب کی تنقیدی کتابوں میں بھی اس طرح کے مقولے اور اقوال بکثرت مل سکتے ہیں۔

پھر اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اگر عیسائی مصنفین کا یہ اعتراض کسی درجہ میں بھی درخور اعتناء ہوتا تو اس کی طرف سب سے پہلے توجہ ان کفار و مشرکین کو ہوتی جو انتہائی عالم بے بسی و کبھی میا قرآن پر حرج گیری کرنے کے لئے تنکے کا سہارا ڈھونڈتے تھے تو پھر کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ جو لوگ اہل زبان تھے شعراء جاہلیت کا کلام جن کے ایک ایک کچھ کی زبان پر تھا اور جو عربی زبان کے اسالیب بیان سے واقف ہوئے عمے باعث شعراء عرب پر بہترین تنقید کر سکتے تھے ان کے حاشیہ خیال میں تو یہ بات کبھی بھی نہیں آئی کہ قرآن مجید کا اسٹائل شعراء و خطباء جاہلیت کے اسٹائل سے ماخوذ ہے اور وہ عیسائی مصنفین جن کا ذوق عربیت اور مسلمانوں کے فن و ادب سے ان کی واقفیت برائے نام ہی ہے وہ اس بے سرو پا اعتراض کی جرأت کرتے ہیں بجا انشاء

پری نہفتہ رخ و دیو در کر ششمہ دناز  
بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بواجبست